راوی فائونڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 20 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ : عامر بن علی

مدیر : حسن عباسی

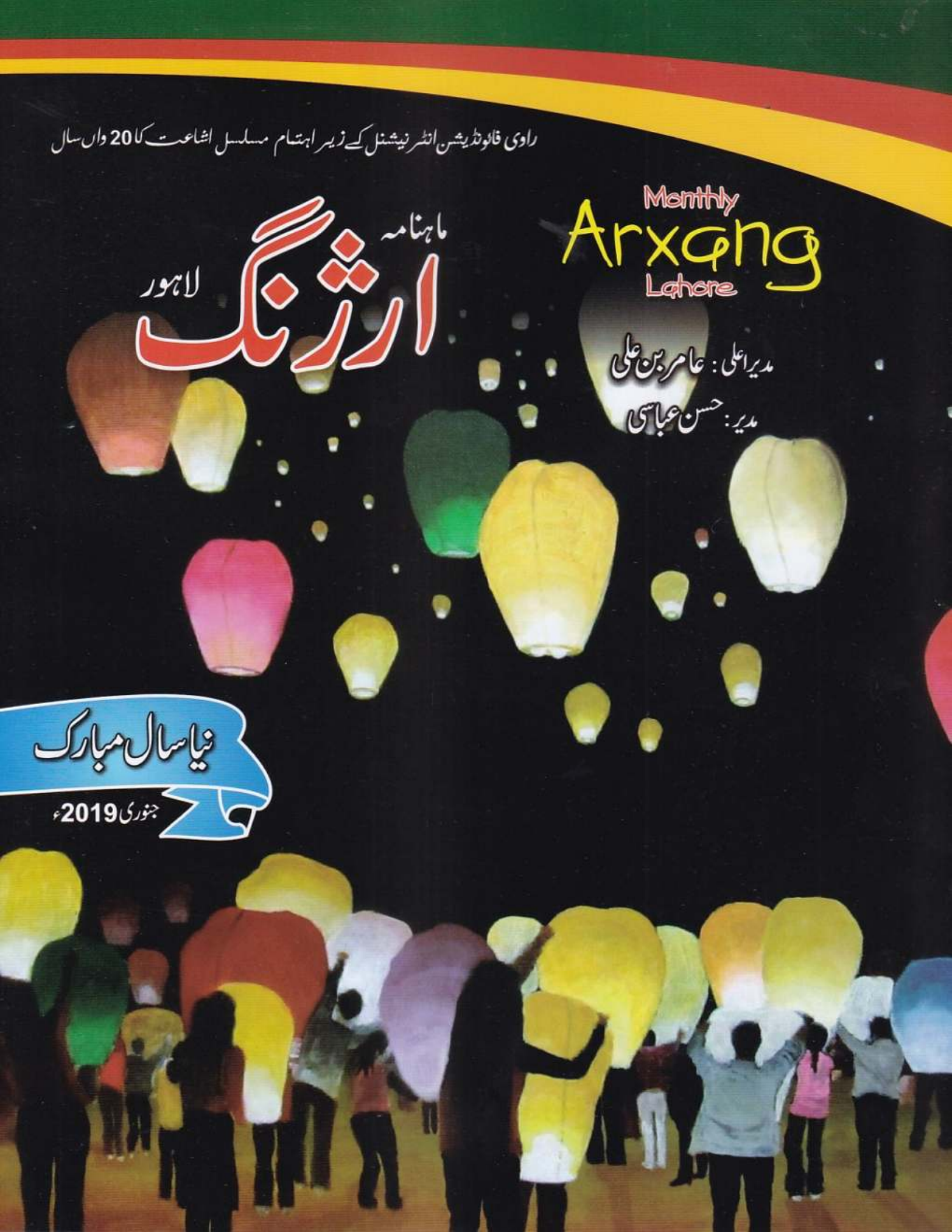

نیا سال مبارک

جنوری 2019ء

کہانیاں میں نہیں لکھتی۔ کہانیاں خود کو مجھ سے لکھواتی ہیں۔

میری اپنی ایک دنیا ہے جس کے آفاق بہت وسیع ہیں

نامور افسانہ نگار اور شاعرہ

فرحت پروین

سے مدیر اعلیٰ ارژنگ معروف شاعر، کالم نگار، سفر نامہ نگار

عامر بن علی کا مکالمہ

ارژنگ: سب سے پہلے اپنے سوانحی وادبی پس منظر سے آگاہی دیجیے؟

فرحت پروین: بات تو تھوڑی عجیب ہے مگر مجھے کبھی بھی آباؤاجداد کے دولت وثروت کے قصوں سے دلچسپی نہیں رہی۔ ابا جی کبھی ذکر کرتے تو میں منہ چڑھی تو تھی ہی۔ صاف کہہ دیتی ''ابا جی مجھے پدرم سلطان بود سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' اب سوچتی ہوں تو دکھ ہوتا ہے کہ یہ تو گستاخی اور دل شکنی تھی۔ نوعمری میں اپنی شخصیت کا کچھ زیادہ ہی احساس ہوتا ہے۔ طارق بٹ نے کیا خوب کہا ہے:

اپنے ماضی کا کوئی نقش سنبھالے رکھنا
کون تھے کیا تھے بتانا کہیں پڑ جاتا ہے

سو اسے چند لائنوں میں سمیٹنے کی کوشش کروں گی۔ میرے اپنے خیال کے مطابق اگر کسی قلمکار کے سوانحی پس منظر میں شعر وادب کی کوئی وراثت نہیں تو وہ اتنا اہم نہیں۔ مگر آپ کا کہنا ہے کہ قارئین کو اس میں دلچسپی ہوتی ہے۔ سو میرے آباؤ اجداد سرائے نو رنگ ضلع بنوں سے تعلق رکھتے تھے۔ گھر میں بول چال کی زبان پشتو تھی۔ ہمارے پردادا خان بہادر سلطان محمود خان رئیس اور جاگیردار تھے جن کی حویلی پر سواری کے لیے گھوڑوں کے علاوہ ہاتھی بھی جھومتے تھے۔

پھر ہمارے دادا خدا بخش خان اپنے دور پار کے رشتہ داروں کو ملنے بھکر آئے جو اُس وقت ایک پسماندہ قصبہ تھا۔ یہاں یک چھوٹی ذات کی لڑکی کے حسن کی چکاچوند نے دیوانہ کر دیا جانتے تھے نہ والد سے اجازت ملے گی اور نہ منگیتر کے خاندان والے زندہ چھوڑیں گے۔ سو اس سے شادی رچا کر بھکر میں ہی مستقل اقامت پذیر ہو گئے کہ واپسی کے راستے انہوں نے خود ہی بند کر دیے تھے۔ پولیس میں ملازمت کر لی۔ تھانیدار ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھکر سے پہلی ٹرانسپورٹ کمپنی کی داغ بیل ڈالی۔ ''خان ٹرانسپورٹ کے نام سے'' دادا کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ابا جی سب سے چھوٹے تھے۔ یوں تو میں نے ابا جی کو علاوہ ڈائری لکھنے کے کچھ خاص لکھتے نہیں دیکھا۔ مگر کسی بچے کی پیدائش، سالگرہ اور شادی کے موقعے پر منظوم مبارک باد لکھتے تھے۔ گلا بھی خوب پایا تھا جب ترنم سے پڑھتے تو رنگ جما دیتے۔ ایک دو موقعوں پر ترنم سے ایک دو غزلیں بھی سنائیں خدا جانے ان کی اپنی تھیں یا کسی کی۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

جلد نمبر 20 نومبر 2019 شمارہ نمبر 1

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

◉ ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ لبنیٰ صفدر

{مجلس مشاورت}

◉ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ ● زرناب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹو گرافر ● نعمان حسن: 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ● محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 بازار کاروی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت / ، ۲

مضامین:

- وہ کام جو اقبال ادھورے چھوڑ گئے / ڈاکٹر جاوید اقبال ، ۳
- پاکستانی معاشرے کا خلفشار اور ادیب کا کردار / مسعود مفتی ، ۸
- اساں دل نوں مرشد جان لیا / عامر بن علی ، ۱۳
- اقبال رہنما / پروفیسر عاشق رحیل ، ۱۴
- آپ ہی کا الاپ ہے صاحب / شہباز نیر ، ۱۵
- بے باک شاعرہ.....فہمیدہ ریاض / ساحل سلہری ، ۱۶

خاکے

- ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے / عطاء الحق قاسمی ، ۱۸
- مستنصر حسین تارڑ / صبوحہ خان ، ۲۰

افسانے

- C.V بمقابلہ C.V / ارم رباب ، ۲۳
- زہریلا انسان / آغا گل ، ۲۴

شاعری / سمندر پار سے ۲۹ تا ۳۳

- عشق رسول ﷺ میں گندھی ہوئی شاعری / ریاض ندیم نیازی ، ۳۴

سفرنامہ

- تاج محل محبت کا کنول / طاہرہ اقبال ، ۳۵
- شاعری ، ۴۳
- انٹرویو: فرحت پروین ، ۴۴
- انٹرویو: سیما غزل ، ۴۹

شعری گوشے:

- نوید مرزا، سلیم ساگر ، ۵۲ تا ۵۳

مختصر ادبی خبریں ، ۵۴

تبصرہ کتب ، ۵۶

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد و نعت

گود جب سے بھری ہے صاحب جی
کھوٹی قسمت کھری ہے صاحب جی
جانے کس نے سکھائی ہے ہم کو
ہر طرف بت گری ہے صاحب جی
میں تر و تازہ کیوں نہیں ہوتا
جب محبت ہری ہے صاحب جی
اُس کہانی کا کیا کیا جائے
وہ جو مجھ میں مری ہے صاحب جی
آسماں سر پہ ہم اُٹھائیں گے
اپنی تو نوکری ہے صاحب جی
آ گئی ہے کنارے سے باہر
لہر کتنی بہری ہے صاحب جی
میرے اندر ہیں کوہ قاف کے جن
میرے اندر پری ہے صاحب جی

حسن عباسی/لاہور

شہرِ طیبہ میں ہر سو پھول ہی پھول
جو بھی مانگیں دعا قبول قبول
ان سا کوئی نہیں زمانوں میں
منفرد ہیں مرے رسولؐ رسولؐ
جس کو عقبیٰ ملے تو اُس کے لیے
اس جہاں کی طلب فضول فضول
کملی والے حضورؐ کی دل سے
ہے غلامی مجھے قبول قبول
انؐ کو مانے بنا نجات ملے
خام ہے خام سوچ، بھول ہی بھول
میرا رستہ ہے آپؐ کی سنت
منزلوں کا یہی حصول حصول
سر کے بل چلتا ہوں مدینے میں
میرے سر میں ہے پاک دھول ہی دھول
آپؐ ہیں سر تا سر عطا ہی عطا
میں سراپا خطا، میں بھول ہی بھول
انؐ کی سوچوں کی بارشوں میں جلیلؔ
نعتِ احمدؐ ہوئی نزول نزول

احمد جلیل/اوکاڑہ

رب نے کونین سجائے ہیں کہ آپؐ آئے ہیں
ابرِ رحمت کے بچھائے ہیں کہ آپ آئے ہیں
دیکھنے والوں نے دیکھا کہ خدا نے کیسے
کنگرے کسریٰ کے گرائے ہیں کہ آپؐ آئے ہیں
نور ہی نور ہے رونق ہے بہاروں کا سماں
سب نے میلاد منائے ہیں کہ آپؐ آئے ہیں
سرمدی نغمے فضاؤں میں ہیں ہر سو گونجے
خوش سبھی اپنے پرائے ہیں کہ آپ آئے ہیں
رب نے بھی جشنِ ولادت پہ سماں باندھا ہے
بت جو کعبے میں گرائے ہیں کہ آپؐ آئے ہیں
اہلِ محفل کی زباں پر ہے صلوٰۃ اور سلام
دیپ نعمت کے جلائے ہیں کہ آپؐ آئے ہیں
حور و غلماں نے شب اسرا سجا کر جنت
سہرے کس شان سے گائے ہیں کہ آپ آئے ہیں
اپنے گھر دیکھ کے ساجدؔ نے خوشی سے جلوے
اشک آنکھوں سے بہائے ہیں کہ آپ آئے ہیں

محمد امین ساجد سعیدی/حاصل پور

آقا ﷺ کے در پہ دیکھو کہ کتنی ہیں راحتیں
جو بھی وہاں گیا اسے ملتی ہیں منزلیں
دامن کبھی کسی کا بھی خالی نہیں رہا
ملتی ہیں اِتنی آقا ﷺ کے دَر سے جو نعمتیں
ہو گی کبھی جو میری بھی روضہ پہ حاضری
دیکھوں گا اپنی آنکھوں سے روضہ کی عظمتیں
روضہ کی جالیوں کو میں چوموں گا دیر تک
مدت سے اپنے دل میں لئے ہوں یہ حسرتیں
نامِ رسول ﷺ میں نے زباں سے لیا کبھی
مٹتی گئیں ہیں آپ مری ساری مشکلیں
جائیں وہاں تو لوٹ کے واپس نہ آئیں ہم
کتنی حسین طیبہ کی گلیوں کی رونقیں
نعتیں جو میں نے اپنا وظیفہ بنا لیا
دشمن کی ہو گئیں سبھی ناکام سازشیں
احمد ﷺ کہوں انہیں یا محمد ﷺ کہوں سہیلؔ
ہر لفظ میں چھپی ہیں برابر کی چاہتیں

اعظم سہیل ہارون/حاصل پور

وہ کام جو اقبال ادھورے چھوڑ گئے

ڈاکٹر جاوید اقبال

بعض اہم موضوعات پر علامہ اقبال نے شعر یا نثر میں کچھ نہ کچھ تحریر کرنے کے منصوبے تو بنائے مگر زندگی نے وفا نہ کی، اس لیے اُن کی تکمیل نہ ہو سکی۔ مثلاً مہاراجہ کشن پرشاد کو خط میں ''بھگوت گیتا'' کا اردو اشعار میں ترجمہ کرنے کے ارادے کا ذکر کرتے ہیں۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو خط میں انگریزی میں ایسی کتاب لکھنے کا ذکر کرتے ہیں جس کا عنوان ہوگا ''اسلام میرے نقطۂ نگاہ سے'' نذیر نیازی فرماتے ہیں کہ حادثہ کربلا پر ہومر کے ''اوڈیسے'' کی طرز پر ایک طویل نظم لکھنا چاہتے تھے۔ ''جاوید نامہ'' میں اضافی ارواح سے ملاقاتوں کے بارے میں لکھنے کا سوچتے تھے۔ انگریزی میں ''ایک غیر معروف پیغمبر کی کتاب'' تحریر کرنے کا منصوبہ تھا۔

آخری ایام میں نواب بھوپال سے وعدہ کیا کہ ''اجتہاد کی تاریخ وارتقا'' کے موضوع پر کتاب لکھیں گے۔ اس سلسلہ میں میاں محمد شفیع (م۔ش) سے انگریزی میں کچھ ابتدائی نوٹس بھی لکھوائے گئے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے نام خط مورخہ 28 مئی 1937ء میں فلاحی ریاست کے قرآنی تصور کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اصل سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے؟ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ اور جدید نظریات کی روشنی میں اُس کی آئندہ ارتقاء میں حل موجود ہے۔ اسلامی قانون کے طویل اور محتاط مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر یہ ضابطۂ قانون صحیح طور پر سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو ہر ایک کے لیے کم از کم زندہ رہنے کا حق محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قانونِ شریعت کا نفاذ اور ارتقا اس سرزمین میں ناممکن ہے جب تک کہ آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں وجود میں نہ لائی جائیں۔ اسلام کے لیے ''سوشل ڈیماکریسی'' کو کسی مناسب شکل میں، جو اسلامی قانون کے اصولوں کے مطابق ہو، قبول کر لینا ''انقلاب'' نہیں بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف واپس جانا ہے۔''

ان منصوبوں میں بعض تو ادبی نوعیت کے ہیں، بعض کا تعلق فلسفہ، مابعد الطبیعات یا دینیات سے ہے اور بعض خالصتاً عنقریب وجود میں آنے والی مسلم ریاست (پاکستان) کی عملی، سیاسی اور معاشی ضروریات سے متعلق ہیں۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ، حادثہ کربلا پر ہومر کے اوڈیسے کی طرز پر نظم لکھنا یا ''جاوید نامہ'' میں اضافی ارواح شامل کرنا، ایسے ادبی منصوبے تھے جو شاعر کے تخلیقی سمندر میں مضطرب لہروں کی طرح ابھرے اور ڈوب گئے۔ لیکن باقی منصوبوں کے بارے میں ایسا گمان کرنا درست نہ ہوگا۔ ''اسلام میرے نقطۂ نظر سے'' یا ''ایک غیر معروف پیغمبر کی کتاب'' جیسی کتب تحریر کرنے کا اگر اُنہیں موقع مل جاتا تو تخلیقی سوچ کے اعتبار سے وہ خطبات ''اسلامی فکر کی تشکیل نو'' کی توسیع ہوتیں۔ اسی طرح ''اجتہاد کی تاریخ وارتقا'' اور ''فلاحی ریاست کا قرآنی تصور'' کے موضوعات پر اگر وہ کتب تحریر کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو اُن کے افکار مسلمانانِ پاکستان کی مزید فکری رہبری کا باعث بن سکتے تھے۔

خطبات ''تشکیل نو'' کن کے لیے تحریر کیے گئے؟ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

''ان لیکچروں کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفہ سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفہ اسلام کو فلسفہ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے اور اگر پرانے خیالات میں خامیاں ہیں تو اُن کو رفع کیا جائے۔''

جب یہ لیکچر علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء نے سنے تو صدر شعبہ فلسفہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے علامہ اقبال سے کہا:

''جناب والا! آپ نے اسلام میں فلسفہ دین کی تشکیل نو کی بنیاد رکھ دی۔ مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلیں اُس کے لیے آپ کے ممنونِ احسان ہیں۔ آپ کی فکر افزا مثال اور لوگوں کی بھی ہمت بندھائے گی۔''

خطبات کے ایک مبصر سلیم احمد تحریر کرتے ہیں:

''اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب کا چیلنج ایک نئی الٰہیات کی تشکیل کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اقبال کی نئی الٰہیات کی کوشش کا حقیقی مقصد مغربی اور اسلامی تہذیب کے درمیان مشترکہ عناصر کی جستجو ہے۔ اگر ہمیں مغربی تہذیب کو قبول کرنا ہے یا اسے اپنے اندر جذب کر کے فائدہ اٹھانا ہے تو ہمیں مغربی اور اسلامی

تہذیب کی روح میں اتر کر اُن کی ہم آہنگی کو الٰہیاتی بنیادوں پر ثابت کرنا پڑے گا۔ ''تشکیلِ جدید'' ان ہی معنوں میں ایک زبردست کارنامہ ہے جسے جدید اسلام کی بائبل کہنا چاہئے۔''

یہ سب اپنی جگہ درست۔ حقیقت یہی ہے کہ خطبات علامہ اقبال کی ایسی تصنیف ہے جسے علماء نے اگر پڑھنے کی کوشش کی تو اُسے ناپسند فرمایا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے تو صاف کہہ دیا کہ یہ کتاب اگر نہ لکھی جاتی تو بہتر ہوتا۔ جہاں تک مسلمانوں کی ''مغرب زدہ'' نئی نسل کا تعلق ہے۔ انہوں نے خطبات کو، جس توجہ کے وہ مستحق تھے، نہیں دی۔ پس علامہ اقبال کی ''فکر افزائی'' اوروں کی ہمت نہ بندھا سکی۔

خطبات کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ انہیں تحریر کرنے کی کئی وجوہ تھیں۔ پہلی یہ کہ علامہ اقبال کو احساس تھا کہ دنیائے اسلام ہر طور پر مغرب کی طرف جھکتی چلی جارہی ہے۔ وہ اِس تحریک کے مخالف نہ تھے کیونکہ یورپی تہذیب عقل و دانش کے اعتبار سے انہی نظریات کی ترقی یافتہ صورت پیش کرتی ہے جن پر اسلام کی تمدنی تاریخ کے مختلف ادوار میں غور و فکر کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں وہ یورپی تہذیب کو ایک طرح سے اسلامی تہذیب ہی کی توسیع خیال کرتے تھے۔ اور مسلمانوں کی نئی نسل کے اِس مطالبے کو جائز سمجھتے تھے کہ اسلامی عقائد اور نظریۂ حیات کا ایک بار پھر جائزہ لے کر ایسی نئی تعبیر یا تشریح کی ضرورت ہے جو وقت کے جدید تقاضوں سے مطابقت رکھتی ہو۔ انہیں خدشہ صرف اس بات کا تھا کہ مادہ پرست یورپی کلچر کی ظاہری چمک دمک ہمیں اتنا متاثر نہ کردے کہ ہم اُس کلچر کے حقیقی باطن تک پہنچ سکنے کے قابل نہ رہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ بقول اقبال انسان مختلف قسم کے رشتوں کے ذریعے خدا اور کائنات سے جڑا ہوا ہے۔ لہٰذا مطالعہ، فطرت یا سائنسی تحقیق بھی اپنی طرح کی عبادت ہے۔ وہ مسلمانوں کی نئی نسل کی توجہ سائنسی علوم کی طرف مبذول کرنے کی خاطر اُن پر واضح کرنا چاہتے تھے کہ اسلام روحانی دنیا کے ساتھ مادی دنیا کو بطور حقیقت تسلیم کرتا ہے اور انسان کو مشاہداتی یا تجربی علوم کی تحصیل سے تسخیر کائنات کی دعوت دیتا ہے۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ علامہ اقبال کے نزدیک روحانی (یا مذہبی) تجربہ بھی ایک نوع کا علم ہے جسے دیگر علوم کی طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے خطبات میں فکری نقطۂ نگاہ سے اسلام کو بطور ارفع مذہب پیش کیا اور بعض آیات کی تعبیر سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مابعد الطبیعات، طبیعات یا مادے اور زماں و مکاں سے متعلق فکری یا تجربی علوم کے نئے انکشافات کی تصدیق قرآن سے کی جا سکتی ہے۔

خطبات کا مطالعہ مختلف جہتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ اور اُنہیں تحریر کرنے کی اور وجوہ بھی بیان کی جا سکتی ہیں۔ جس طرح پہلے کہا جا چکا ہے، اگر علامہ اقبال ''اسلام میرے نقطۂ نگاہ سے'' یا ''ایک غیر معروف پیغمبر کی کتاب'' لکھنے میں کامیاب ہو جاتے تو یقیناً وہ خطبات ''تشکیل نو'' کی توسیع ہوتیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ یہ کام صرف علامہ اقبال خود ہی انجام دے سکتے تھے۔ اس میدان میں اُن کی ''فکر افزا'' مثال نے پہلے کسی کی ہمت نہ بندھائی تو اب کیا بندھائے گی؟

اب علامہ اقبال کے ''اجتہاد کی تاریخ وارتقا'' کے موضوع پر کتاب لکھنے کے ارادے کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ''اجتہاد'' کے مطالبے میں علامہ اقبال نے پہل نہیں کی۔ برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی و تمدنی زوال و انتشار کے عالم میں دراصل شاہ ولی اللہ نے اس مسئلہ کو اٹھایا اور اپنے وضع کردہ فقہی اصول ''تلفیق'' کے تحت اہل سنت والجماعت فرقہ کو اُن کے چار مدرسہ ہائے فقہ (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) میں سے ہر کسی معاملے میں سب سے سہل اور راہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔ یہ صحیح معنوں میں اجتہاد تو نہ تھا مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سنیوں کے چاروں فقہی مذاہب کے علماء ایک دوسرے پر کفر کے فتوے صادر کرتے رہے۔ شاید اسی بنا پر بعد میں سرسید احمد خان نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں نے اگر ''تقلید'' کو نہ چھوڑا تو برصغیر میں اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ علامہ اقبال نے 1924ء میں جب ''اجتہاد'' کے موضوع پر اپنا پہلا خطبہ دیا تو اُن پر کفر کے فتوے لگے تھے۔ بعد ازاں اسی خطبہ کو بہتر صورت میں خطباتِ ''تشکیلِ نو'' میں شامل کیا گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے ''اجتہادِ مطلق'' پر اصرار کے اسباب کیا تھے؟

علامہ اقبال نے مسلمانوں کے علمی، دینی، سیاسی، تہذیبی، معاشی زوال کی جو وجوہ بیان کی ہیں اُن میں نمایاں تین ہیں: ملوکیت، ملائیت اور خانقاہیت۔ اُن کے خیال میں اسلام کا ''نزول'' اس وقت ہوا جب انسان کی عقلِ ''استقرائی'' بالغ ہو چکی تھی اور اُسے نبیوں، مذہبی پیشواؤں اور بادشاہوں جیسے سہاروں کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اسلام نے اعلان کیا کہ نبوت ختم ہوگئی۔ اسلام میں پرانے

مذاہب کی مانند کسی قسم کی پاپائیت یا مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں۔ مسلمانوں نے ابتداء ہی میں ساسانی اور رومن سلطنتوں کا خاتمہ کر کے ثابت کر دیا کہ ملوکیت کا تعلق عہد جہلیت سے تھا۔ پس بقول علامہ اقبال اسلام کا پیغام سلطانی جمہور کا قیام ہے اور یہ کہ اب شعور کی بلوغت کے سبب انسان وحی اور اُس کے احکام کی تعبیر و تشریح خود کر سکتا ہے اور اُس کی بقا اسی میں ہے کہ کرتا رہے۔

علامہ اقبال ''اجتہاد مطلق'' پر اس لیے بھی زور دیتے ہیں کہ اُن کے مطابق اسلام مسلمانوں کو 'ثبات فی التغیر'' کے اصول پر زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ قرآنی احکام جو عبادات سے متعلق ہیں اُن میں کسی ردوبدل کی گنجائش نہیں، اُنہیں ثبات حاصل ہے لیکن جن احکام کا تعلق ''معاملات'' سے ہے وہ اصول تغیر کے تحت ہیں اور وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق اُن میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اسی سبب علامہ اقبال کی رائے میں ''اجتہاد'' بطور عمل اسلام کی ابتدا ہی کے ساتھ جاری ہو گیا تھا۔ علامہ اقبال ''اجتہاد'' کی تعریف ''اصول حرکت'' کے طور پر کرتے ہیں۔ اسی بنا پر فرماتے ہیں کہ جو اجتہادات ماضی میں کیے گئے وہ اپنے اپنے زمانوں کے مطابق درست تھے۔ مگر وہ حال کی ضروریات کے مطابق صحیح قرار نہیں دیے جا سکتے۔ جو کوئی بھی اجتہاد کی تاریخ اور ارتقا کے موضوع پر مستند کتاب لکھنے کا اہل ہو گا وہ اپنے وقت کا مجدد قرار پائے گا۔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ شاید یہ ایک شخص کا کام نہ ہو بلکہ اُسے انجام دینے کے لیے فقہا کا ایک بورڈ قائم کرنا پڑے۔ اور اُس کی تکمیل کے لیے خاصی مدت لگے۔

- اگر سوال کیا جائے کہ علامہ اقبال کی سوچ کا ''عطر'' کیا ہے؟ تو اُس کا جواب اُن کے ''جاوید نامہ'' کے اُن چند اشعار سے دیا جا سکتا ہے جب وہ خدائے اسلام کے حضور میں کھڑے ہیں اور خداوند تعالیٰ کے منہ ہی سے کہلواتے ہیں ؎

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست
از جمالِ ما نصیب خود نُبرد
از نخیلِ زندگانی برنخورد

(ہر وہ جو تخلیقی سوچ کی قوت نہیں رکھتا، ہمارے نزدیک اصل کافر اور منافق ہے۔ اُس نے ہمارے جمال میں سے اپنا نصیب حاصل نہیں کیا۔ اور وہ زندگانی کے درخت کا پھل کھانے سے محروم رہا۔)

علامہ اقبال کو اس المیہ کا بخوبی احساس تھا کہ تحریک پاکستان سے پیشتر برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی تحریکیں، یعنی تحریک (وہابی) مجاہدین اور اُس کے بعد تحریک خلافت، جو اسلام کے نام پر چلیں۔ اِس لیے ناکام ہوئیں کہ اُن کے پیچھے سوچ ''تقلیدی'' تھی۔ تحریک پاکستان بھی اسلام ہی کے نام پر چلی، لیکن اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی، اس لیے کہ اس کے پیچھے سوچ ''اجتہادی'' تھی۔ علامہ اقبال نے ''علاقائی قومیت'' کے مغربی تصور کو ''اسلامی یا مسلم قومیت'' کے تصور کے طور پر پیش کیا۔ یعنی اگر مشترک علاقہ، زبان یا نسل کی بنیاد پر انسانوں کا گروہ ایک قوم بن سکتا ہے تو مشترک روحانی مطمع نظر کی بنیاد پر مسلمان ایک قوم کیوں نہیں کہلا سکتے؟ 1930ء میں خطبہ الٰہ آباد میں علامہ اقبال نے ''مسلم قومیت'' کے اسی اصول کی بنیاد پر علیحدہ ''ریاست'' کا مطالبہ کیا۔ اُس سے پیشتر 1929ء میں وہ اپنا خطبہ ''اجتہاد بطور اصولِ حرکت'' دے چکے تھے۔ وفات سے چند روز قبل اسی موضوع پر علامہ اقبال کا مناظرہ دیو بند کے مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ ہوا۔ مولانا کا موقف تھا کہ برصغیر کے مسلمان ''قوم'' کے اعتبار سے ہندوستانی ہیں مگر ''ملت'' کے اعتبار سے مسلمان۔ علامہ اقبال نے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے نزدیک ''قوم و ملت'' میں کوئی امتیاز نہیں، دونوں کے ایک ہی معانی ہیں۔ پس بالآخر اسی اجتہادی سوچ کے نتیجہ میں برصغیر کے مسلم اکثریتی صوبوں نے پاکستان کو وجود میں لا کر سیاسی و تہذیبی آزادی حاصل کی۔

اگر پاکستان اجتہادی سوچ کا نتیجہ ہے تو اسلامی قانون سازی کے معاملے میں اجتہادی کے ذریعہ زندہ رہ سکتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ اقبال آئین کے تحت جمہوری طور پر منتخب پارلیمنٹ (اجماع یا شوریٰ) کو اجتہاد کا حق دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک آئندہ کے مجتہد وہ قانونی ماہرین یا وکلاء ہونے چاہئیں جنہوں نے ''اسلامی فقہ'' اور ''جدید جورسپروڈنس'' کے تقابلی مطالعہ کے موضوع پر اعلیٰ تربیت حاصل کی ہو۔ ایسے قانونی ماہرین کسی نہ کسی سیاسی جماعت کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر قانون ساز ادارے یعنی پارلیمنٹ کے رکن بن سکتے ہیں اور اسلامی قانون سازی میں مدد فراہم کر سکتے ہیں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال حکومت کی۔ اس دوران بادشاہوں نے قلعے بنائے تو اپنی حفاظت کے لیے، محل بنائے تو اپنی عیش و عشرت کے لیے، مقبرے بنائے

تو اس لیے کہ یاد رکھے جائیں اور مساجد تعمیر کرائیں تاکہ اللہ تعالیٰ اُن کے گناہ معاف کر دے۔ لیکن نہ کوئی دارالعدل کی عمارت نظر آئیگی نہ دارالعلم کی۔ بادشاہوں کی تاریخ کی کتب سے ہم اتنا جانتے ہیں کہ فیروز تغلق کے زمانہ میں آئین فیروز شاہی لاگو ہوا یا اورنگزیب کے عہد میں فتاویٰ عالمگیری کی روشنی میں انصاف کیا جاتا تھا۔ ایسی کتب موجود نہیں جن سے معلوم ہو سکے کہ اس دوران عدل گستری کے لیے نافذ قوانین کی نوعیت کیا تھی؟ اسی طرح ایسی کتب موجود نہیں جو اس دوران ہمیں اپنی تہذیبی ارتقا کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں۔ یعنی کیا اس مسلم دور کے ہندوستانی مدرسوں نے علم الکلام، فلسفہ یا تجربی علوم میں کوئی اہم یا قابل ذکر ہستیاں پیدا کیں؟ اگر علامہ اقبال قیام پاکستان کے بعد زندہ رہتے تو ایسے سب میدانوں میں تحقیق کی ضرورت پر زور دیتے۔

اب قائداعظم کے نام علامہ اقبال کے خط میں ''فلاحی ریاست کے قرآنی تصور'' کے بارے میں غور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے اس موضوع پر کوئی مستند مقالہ یا خطبہ تو تحریر نہیں کیا۔ شعر ونثر میں چند اشارے موجود ہیں۔ البتہ وہ مارکسزم، کمیونزم یا اشتراکیت کے اتنے ہی خلاف تھے جتنے کیپٹلزم، سرمایہ داری یا جاگیرداری کے۔ اُن کے خیال میں انسانی بہبود یا فلاح کا ہر وہ نظام جو روحانیت سے عاری ہو، انسان کے لیے صحیح سکون و اطمینان کا باعث نہیں بن سکتا۔ شاید اسی بنا پر اُنہوں نے خطبات میں شامل اپنے خطبہ ''اجتہاد'' میں فرمایا کہ اسلام کا اصل مقصد ''روحانی'' جمہوریت کا قیام ہے۔ علاوہ اس کے پیش گوئی کی تھی کہ سوویٹ روس میں کمیونزم بطور نظام ختم ہو جائے گا، جو بالآخر درست ثابت ہوئی۔ مغربی تہذیب کے روحانیت سے عاری سرمایہ دارانہ نظام کے استبداد کے بارے میں بھی وہ سمجھتے تھے کہ شاخِ نازک پر بنایہ آشیانہ ناپائیدار ہوگا۔ علامہ اقبال کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ وہ سرمایہ اور محنت کے درمیان توازن کو اسلامی نظام معیشت قرار دیتے ہوئے اسے ''اقتصاد'' کا نام دیتے ہیں یعنی درمیانہ طبقہ کی فلاحی ریاست۔ بہرحال یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اگرچہ علامہ اقبال نے ابتدائی زمانہ میں ''پولیٹیکل اکانومی'' پر کتابچہ تحریر کیا اور قیام انگلستان کے دوران ''اکانومکس'' کی کلاسوں میں بھی شریک ہوتے رہے، وہ صحیح معنوں میں تربیت یافتہ اکانومسٹ یا اقتصادیات کے ماہر نہ تھے۔

1926ء میں علامہ اقبال پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ اُس زمانہ میں ''انڈسٹری'' کے میدان میں تو مسلمانوں کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ البتہ ''جاگیرداری'' کا مسئلہ تھا۔ لہٰذا اِس موضوع پر کونسل میں اُن کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کو زمین کا مالک سمجھتے تھے۔ یعنی اُن کے نزدیک چار بنیادی عنصر جن سے کائنات تشکیل کی گئی :آگ، پانی، ہوا اور زمین سب خدا کی ملکیت ہیں۔ لہٰذا انسان اصولی طور پر زمین کا مالک نہیں محض ''ٹرسٹی'' ہے تاکہ اُس کے ذریعہ روزی کما سکے۔ اس اصول کا اطلاق وہ ''کراؤن'' یا ''سٹیٹ'' پر بھی کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ''کراؤن'' (سٹیٹ) کے تصرف میں جو اراضی ہے وہ آسان قسطوں پر بے زمین کاشتکاروں میں بانٹ دی جائے۔ نیز جاگیردار کے پاس اتنی اراضی رہنے دی جائے جو وہ خود کاشت کرتا ہو۔ گویا علامہ اقبال جاگیردار کے ''ٹینینٹ'' سے ''بٹائی'' (مخابرہ) لینے کے بھی خلاف تھے۔ اسی طرح اُس زمانہ میں بڑے زمینداروں پر ''ایگریکلچرل'' ٹیکس لگانے کی تجویز پیش کی، جو ٹیکس عشر اور زکوٰۃ کی وصولی کے علاوہ تھا۔ علامہ اقبال مسلم جاگیرداروں پر اسلامی قانونِ وارثت کے سختی کے ساتھ اطلاق سے بھی سمجھتے تھے کہ یوں چند نسلیں گزرنے کے بعد جاگیرداری کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ان باتوں سے ظاہر ہے کہ علامہ اقبال ''لینڈ ریفارم'' کے بارے میں مخصوص نظریہ رکھتے تھے۔

تاریخی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو مسلم معاشرہ کی معیشت کی بنیادیں دراصل ابتدا ہی سے ''فیوڈل'' (جاگیرداری) نظام پر قائم ہونے کی بجائے ''مرکنٹائیل'' (تجارتی) نظام پر قائم تھیں۔ اسی لیے اسلامی فقہ میں ''مال'' سے مراد ''سرمایہ'' (ویلتھ) بھی ہے اور ''اراضی'' (اسٹیٹ) بھی۔ نیز تجارت کے ذریعہ پیداوار بڑھانا یا منافع کمانا اخلاقی طور پر عمدہ اسلامی خصائل سمجھے جاتے تھے۔ ''تجارتی معیشت'' (مارکیٹ اکانومی) کے لئے ''سرمایہ'' کی فراہمی کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ اِس لئے اگرچہ اسلامی قانون کے مطابق ربٰو حرام ہے لیکن ایسے لین دین کو مختلف ''حیلوں'' کے ذریعے جاری رکھا گیا۔ بقول ناصر خسرو گیارھویں صدی اصفہان میں ''تبادلۂ سرمایہ'' (منی ایکسچینج) کی خاطر دو سو کے قریب کاروباری ادارے موجود تھے جو یہی کاروبار کرتے تھے۔ علامہ اقبال معاشرہ میں سرمایہ (کیپٹل) کی

قوت کو بالکل ختم کرنا نہیں چاہتے بلکہ ''مارکیٹ اکانومی'' کے فروغ کے لیے اُس کی موجودگی کو اہم خیال کرتے ہیں۔ اسی سبب مولانا شبلی کی طرح بینک کے سود کو ''منافع'' قرار دیتے ہیں کیونکہ اس میں استحصال کا ویسا امکان نہیں جو ربوٰ کی وصولی میں ہے۔

پرانے زمانے کی اسلامی ریاست کی آمدنی کے ذرائع مختصراً یہ تھے: ذمیوں سے ''جزیہ'' اور اگر اراضی کے مالک ہوں تو ''خراج'' کی وصولی۔ غنیمہ۔ مسلمانوں سے، اگر اراضی کے مالک ہوں تو ''عشر'' اور اُس کے علاوہ ''زکوٰۃ'' کی وصولی (اگر رضا کارانہ طور پر ادا کی گئی ہو تو) ریاست کو ''تجارتی معیشت'' کے ذریعہ منافع پر مختلف نوعیت کے ٹیکسوں کی آمدنی بھی ہوتی تھی۔ معاشیات کے بارے میں تحریر کرنے والوں میں امام ابو یوسف کی ''کتاب الخراج'' معروف ہے۔ مگر ابن خلدون، البیرونی، ابن تیمیہ، ناصر طوسی، ابن مسکویہ اور اخوان صفا نے بھی اپنی کتب میں ایسے مسائل پر بحث کی ہے۔

جہاں تک انسان کے بنیادی حقوق کا تعلق ہے قرآن کی سورۃ طٰہٰ آیات 118, 119 میں اللہ تعالیٰ آدم سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: ''اے آدم! تمہارے لیے یہاں انتظام ہے۔ نہ بھوکے ننگے رہو گے نہ گرمی تمہیں ستائے گی۔'' ان آیات کے ساتھ اگر ترمذی کی بیان کردہ حدیث پڑھی جائے کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد کیا: ''آدم کے بیٹے کے تین حقوق ہیں، رہنے کو مکان، ننگا پن چھپانے کو کپڑا اور کھانے پینے کو روٹی اور پانی۔ تو اسلامی فلاحی ریاست کے ارباب بست وکشاد پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ہر شہری کو یہ سہولتیں فراہم کریں۔ اور اب تو اُن میں دو مزید حقوق یعنی بلا معاوضہ تعلیم اور مفت طبی امداد کا اضافہ ہو گیا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ علامہ اقبال خاندانی منصوبہ بندی کے اِس طرح قائل تھے کہ اگر بیوی اولاد پیدا نہ کرنا چاہے تو خاوند اسے مجبور نہیں کر سکتا۔

علامہ اقبال جب قائداعظم کو اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ اسلامی قانون کے طویل مطالعہ سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کی ''جدید نظریات'' کی روشنی میں ارتقا کے ذریعے قابل قبول ''سوشل ڈیما کریسی'' قائم کی جا سکتی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے: وہ اپنے اس دعویٰ کی بنیاد کن قرآنی آیات پر استوار کرتے ہیں؟ عین ممکن ہے انہوں نے فلاحی ریاست کے قرآنی تصور کی بنیاد سورۃ البقرہ آیت 219 اور سورۃ الذریات آیت 19 پر رکھی ہو۔ سورۃ البقرہ آیت 219 میں حکم ہے: ''پوچھتے ہیں اللہ کی راہ میں کیا خرچ کیا جائے؟ قل العفو (کہو جو ضرورت سے زائد ہے)!!'' اس ضمن میں علامہ اقبال کے اشعار قابل غور ہیں۔

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

جو حرفِ ''قل العفو'' میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

''قل العفو'' کے بارے میں ''تقلیدی'' سوچ تو یہی ہے کہ انسان رضا کارانہ طور پر جو اپنی ضرورت سے زائد یا فالتو سمجھے خدا کی راہ میں دیدے۔ مگر ''جدت کردار'' سے علامہ اقبال کی کیا مراد ہے؟ کیا یہ طے کرنے کے لیے کہ ضرورت سے زائد یا فالتو کیا ہے، ریاست کی مداخلت ضروری ہے؟ سورۃ الذریات آیت 19 میں ارشاد ہوتا ہے ''دولت مندوں کے مال میں ناداروں اور محروموں کا حصہ ہے'' کیا علامہ اقبال کے نزدیک اس حصہ کا تعین کرنے کی خاطر بھی ریاست کی مداخلت ضروری ہے؟ علامہ اقبال کے ارشادات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے بنیادی حقوق کے قرآنی تصور اور دولت مندوں کی ذمہ داری سے متعلق قرآنی احکام کے تحت ''روحانی'' بنیادوں پر قائم ''سوشل ڈیما کریسی'' یا ''اسلامی فلاحی ریاست'' وجود میں لائی جا سکتی ہے۔

بہر حال خصوصی طور پر ''اجتہاد کی تاریخ وارتقا'' اور ''فلاحی ریاست کا قرآنی تصور'' کے موضوعات پر کتب تحریر کرنا ایسے کام تھے جو علامہ اقبال تو ادھورے چھوڑ گئے مگر علامہ اقبال کے نام پر قائم سرکاری یا غیر سرکاری ادارے انجام دے سکتے ہیں یہی امید ہمیں اس ادارے سے رکھنی چاہئے جو میاں اقبال صلاح الدین اور اُن کے رفقاء نے علامہ اقبال کے نام پر قائم کیا ہے۔ شاید ''اجتہاد کی تاریخ وارتقا'' پر کوئی مستند کتاب تحریر کرنے کی خاطر علماء وفقہا کا بورڈ قائم کرنے کی ضرورت پڑے۔ اسی طرح ''فلاحی ریاست کا قرآنی تصور'' کے موضوع پر کچھ تحریر کرنے کی خاطر ماہرین اقتصادیات کی خدمات حاصل کرنی پڑیں۔ علامہ اقبال احیائے اسلام کے شاعر ہیں۔ انہوں نے فرما رکھا ہے کہ وہ ''حرفِ آخر'' نہیں۔ اگر اُن کا شروع کردہ عمل احیاء واقعی جاری ہے تو بقول اُن کے، اُن کے پیش کردہ نظریات سے بہتر نظریات سامنے آ سکتے ہیں۔ ضرورت صرف ان کے اس شعر کو ملحوظ خاطر رکھنے کی ہے ؎

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست

پاکستانی معاشرے کا خلفشار اور ادیب کا کردار

مسعود مفتی

آج مجھے جو موضوع دیا گیا ہے اس کی مناسبت سے یہ تحریر تو نئی ہے مگر خیالات میری پرانی تحریروں کی کشید ہیں۔ اس لیے کوئی حرج نہیں اگر آغاز میں ہی اختتام بھی بتا دیا جائے کہ ہمارے معاشرے کا خلفشار قابل فہم ہے اور ایک حد تک مایوس کن ہے۔ مگر ہمارے ادیب کا کردار نا قابل فہم ہے اور بے حد مایوس کن ہے۔ اتنا کہ اقبال کی روح بھی تڑپ رہی ہوگی کہ کیا واقعی

ع شاعر رنگین نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

اس مرکزی خیال کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس خلفشار کی نوعیت یا کیمسٹری (Chemistry) سمجھ لیں۔ میری حقیر سوچ کے مطابق یہ خلفشار دراصل اس تہہ در تہہ زنگ کے اُکھڑے ہوئے ٹکڑے ہیں جو مسلم اُمہ کے دل و دماغ پر اتنے عرصہ سے جم رہا تھا کہ علامہ اقبال نے اجتہاد والے چھٹے لکچر میں اسے ''پانچ صدیوں کا جمود'' قرار دیا۔[1] اس جمود سے پہلے مسلم اُمہ کے فکر و عمل میں لوہے جیسی مضبوطی تھی۔ مگر جمود کے بعد اس کے ڈھانچے میں صرف کھوکھلی انا ہے۔ اس لیے یہ زنگ سائنس کی اصطلاح والا Iron Oxide نہیں بنتا بلکہ نفسیاتی بیمار والا Self Oxide بن جاتا ہے۔ چنانچہ ہم ہر دم اپنی ذات، اپنے خاندان، اپنی برادری، اپنے قبیلے یا اپنے مسلک کی بالادستی چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ مسلم فرد کی ساری عبادت اپنی ذات کی بخشش کے لیے ہے اور مسلم بادشاہ کی ساری ریاضت اپنے خاندان کے موروثی اقتدار کے لیے ہے۔

اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مگر میرے خیال میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سنہ ۱۳۰۰ء کے آس پاس حقوق اللہ والے مسلمان نے اجتہاد کا دروازہ ایسے دھڑاک سے بند کیا کہ حقوق العباد والے مسلمان باہر ہی رہ گئے۔ سوال اور سوچ خارج از اسلام ہو گئے۔ ابن خلدون، البیرونی، ابنِ رُشد اور دیگر مسلم فلسفیوں کی بالغ نظری دم توڑ گئی اور سماجی انصاف کے ساتھ ساتھ ریاستی احتساب بھی پامال ہو گیا۔ تواریخ گواہ ہیں کہ ایسی ہی فضا میں ذاتی مفادات قومی مفادات سے افضل ہو جاتے ہیں۔ ذات ریاست پر حاوی ہو جاتی ہے اور حب الوطنی میں غداری کی دیمک لگ جاتی ہے۔ یہی وہ اجزائے ترکیبی ہیں، جو کسی بھی زمانے میں خلفشار اور انتشار کی کیمسٹری بن جاتے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں جب پاکستانی سب سے بڑی اسلامی ریاست کے طور پر اُبھرا۔ تو فوراً ہی اس جمود زدہ اسلامی زنگ کی لپیٹ میں آ گیا اور اپنی ذات، اپنا خاندان، اپنی برادری، اپنا قبیلہ اور اپنا مسلک نئی ریاست پر حاوی کرنے کی دوڑ لگ گئی۔ شروع سے ہی تین کھلاڑی اس دوڑ میں شریک پائے گئے۔

پہلا کھلاڑی اس تیزی میں تھا کہ خود قائداعظم کو دھکا مارتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ قائداعظم کے احتجاج کی گونج ان کی تقاریر کے مجموعے کے صفحہ ۲۶۵ پر ہے۔[2] ۱۴ جون ۱۹۴۸ء کو سٹاف کالج کوئٹہ کی تقریب میں آرمی افسران سے گفتگو میں قائداعظم کا ماتھا ٹھنکا تو اپنی تقریر میں تبدیلی کرتے ہوئے انہوں نے فوری طور پر فوجی افسروں کی توجہ ان کی ملازمت کے حلف نامے کی طرف دلائی اور یاد دلایا کہ آئین کے تحت وہ صرف اور صرف گورنر جنرل کی سویلین اتھارٹی کے ماتحت ہیں۔ مگر قائداعظم ستمبر ۱۹۴۸ء میں فوت ہوئے تو چند ہی ماہ بعد بریگیڈیئر اکبر خان نااہل اور کرپٹ سویلین حکومت پر فوجی قبضے کے لیے رابطے کر رہے تھے۔[3] جنوری ۱۹۵۱ء میں جنرل ایوب خان کمانڈر ان چیف بنے تو اکبر خان میجر جنرل بن کر ان کے چیف آف جنرل سٹاف بن گئے۔ ان کے گھر میں منعقدہ میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ چار مارچ ۱۹۵۱ء کو جب وزیراعظم اپنی کابینہ سمیت راولپنڈی آئیں تو ان سب کو گرفتار کر کے حکومت کا تختہ اُلٹ دیا جائے۔[4] مگر بات باہر نکل گئی۔ فروری کے مہینے میں راولپنڈی سازش کیس میں گرفتاریاں ہوئیں اور اسی برس اکتوبر کے مہینے میں وزیراعظم لیاقت علی خان قتل ہو گئے۔ قاتل تو وہیں مارا گیا مگر قتل کروانے والوں کا سراغ آج تک نہیں ملا۔

اس دوڑ کے دوسرے کھلاڑی وہ وڈیرے تھے جنہیں قوم کی غلامی کی زنجیریں مضبوط کرنے کے عوض بیرنی حاکموں کی طرف سے قریباً ایک صدی اور تین نسلوں تک جاگیریں، مراعات اور بالانشینی ملتی رہی۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں وہ اسمبلیوں پر قابض ہو گئے۔ انگریز گئے تو تخت پر قابض ہو گئے اور پھر اس قبضے کو

دائمی بنانے کے لیے وہ ہر غلط ہتھکنڈہ استعمال کرنے لگے۔ چنانچہ نئے ملک کا نیا آئین بنانے کو اس کا میابی سے روکا کہ پہلے سات برس میں دستور ساز اسمبلی کی تمام میٹنگوں کا مجموعی دورانیہ نصف برس سے زیادہ نہ تھا[۵] اور آئین کا دور دور بھی پتہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ انگریز کی محافظ چھتری ہٹ جانے کے بعد انہیں ایک طاقتور ساتھی کے دست شفقت کی ضرورت تھی۔ اس لیے ۱۹۵۴ء میں کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خان کو ڈیفنس منسٹر بنا دیا گیا اور قومی کابینہ میں ایک باوردی وزیر شامل کرنے کی نئی رسم ڈالی گئی۔ اپنی کتاب Friends not masters میں جنرل ایوب نے لکھا ہے کہ انہوں نے اسی وقت اپنی منصوبہ بندی شروع کر دی اور ۱۹۵۴ء کے بعد ملک میں جو کچھ ہوا وہ انہی کے منصوبوں کے مطابق ہوا۔ اس طرح ان دو کھلاڑیوں کے متحدہ Self Oxide نے اس نئے ملک پر اپنا تسلط جما لیا۔

اس دوڑ میں شریک تیسرا کھلاڑی جب خود کو ''علمائے کرام'' کہتا تھا تو علامہ اقبال حیرت سے پوچھتے تھے ع ابلہ کو نیا ہے کیوں دانا ئے دیں..... مگر نادان قوم انہیں بدستور دانا کا رتبہ دیتی رہی۔ یہ کھلاڑی قریباً ایک صدی تک انگریز کی خفیہ ایجنسیوں کی معاونت کرتا رہا۔ آخری وقت تک پاکستان کے مطالبے کی مخالفت کرتا رہا اور جمعیت العلمائے ہند کے مولانا حسین احمد مدنی کے فتوے کی حمایت میں قائداعظم کو (اللہ نہ کرے) ''کافر اعظم'' کہتا رہا۔[۶] حتیٰ کہ پاکستان قائم ہوا تو اسے قومی تحریک کی منزل مقصود نہ کہا بلکہ مملکت خداداد کہا تا کہ خدا کا یہ خود ساختہ ٹھیکے دار اس پر اپنا حق جما سکے۔ چنانچہ خیمے میں گردن ڈالنے والے اونٹ کی طرح یہ ۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد (Objective Resolution) پاس کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ بغیر اس وضاحت کے کہ آیا یہ خلافت راشدہ، اقبال اور جناح کے سماجی انصاف والا اسلام ہوگا یا ''دینِ ملائی سبیل اللہ فساد'' والا اسلام ہوگا۔ اسی لیے مولانا حسرت موہانی نے فوراً کہا[۷] کہ اللہ کی حاکمیت کے ارفع نظریہ کا سہارا لینے والے دراصل بے ایمانی کر کے زمین پر کوئی خود کار آئینی ڈھانچہ یا آئین نہیں بنانا چاہتے۔ کیونکہ آئین زمان و مکان کا پابند ہوتا ہے اور اللہ کی حاکمیت والا ارفع نظریہ زمان و مکاں سے ماورا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ لوگ اللہ کی حاکمیت کے نام پر اپنی سرداری قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بعد ازاں جنرل ضیاء کی نیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس لیے انہوں نے پورے اونٹ کو خیمے میں داخل کر لیا اور فوجی اعزاز کے ساتھ جُبہ و دستار پہنا دیے۔

یہ واقعات صاف ظاہر کرتے ہیں کہ پاکستان کے پہلے دو برسوں میں ہی ان میں تین کھلاڑیوں کی Self Oxide والی دوڑ شروع ہو چکی تھی جو بعد میں مُلا، ملٹری ڈکٹیٹر، وڈیرہ'' گٹھ جوڑ کی شکل میں ایک مضبوط ''اتحاد ثلاثہ'' بن کر اُبھری۔ مگر اس مشترکہ ٹیم کی بنیاد ۱۹۴۷ء میں ہی پڑ چکی تھی۔ جس نے اپنا بدنیتی کا کھیل نئی ریاست کے آغاز میں ہی عین اس زمانے میں شروع کر دیا۔ جب نیک نیت اور پرخلوص نوجوان فضل محمود، حفیظ کاردار، خان محمد، امتیاز اور شجاع الدین وغیرہ اس نئی قوم کو کرکٹ کے آسمان پر لے جا رہے تھے۔ مگر المیہ یہ تھا کہ اس اتحاد ثلاثہ کی قبضہ اننگ تب سے اب تک ختم ہی نہیں ہوئی۔ قوم صرف فیلڈنگ کرتی رہی۔ مگر آج تک ان میں سے کسی ایک کو بھی آؤٹ Out نہیں کر سکی۔ کیونکہ اطاعت گزار بیٹ، لنگڑے بال اور فرماں بردار وکٹ یہ خود ہی بتاتے ہیں۔ ایمپائر ان کے اپنے مقرر کردہ ہیں۔ کھیل کے عجیب و غریب قوانین یہ خود بناتے ہیں جن کی دنیا بھر میں مثال نہیں ملتی۔ جیسے NRO اور NAB کے قوانین۔[۸] اسمبلی والے کھلاڑی کو ترقیاتی فنڈز کے قوانین، سرکاری ملازموں کی سیاسی چاکری کے قوانین اور ہر وہ قانون جس سے ان کا اور صرف ان کا کھیل جاری رہ سکتا ہے۔ ان قوانین کے علاوہ دھونس بھی ان کی اور دھاندلی بھی ان کی۔

دراصل ہمارے عوام کے سیاسی خلفشار کی اندرونی کیمسٹری Chemistry ہی یہی ہے اور اسی مایوسی، ناکامی اور محرومی سے بنی ہے کہ اتحاد ثلاثہ کی اننگ Inning ختم ہونے اور ان کی اپنی اننگ شروع ہونے کی کوئی اُمید نظر نہیں آتی۔ خصوصاً جب اس اتحاد کا اپنا تراشا ہوا کرکٹ بورڈ میچ فکسنگ (Match Fixing) کے ہتھکنڈوں سے بدامنی، لاقانونیت، فرقہ واریت، لوڈ شیڈنگ Load Shedding کرپشن اور مہنگائی کو بڑھا کر اس خلفشار میں مزید اضافہ کرتا جاتا ہے۔ تاکہ قوم نہ تو صحیح انداز میں باؤلنگ Bowling کر سکے۔ نہ دل جمعی سے کوئی کیچ (Catch) کر سکے اور نہ رن آؤٹ Run out کے لیے صحیح نشانہ لگا سکیں۔ سوائے ایک نشانے کے جس میں شہریوں کی اپنی ہی خودکشی یا خودسوزی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ قومی خلفشار جاری رہتا ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک اس تین ٹانگوں والے پیر تسمہ پا سے نجات نہیں ملتی۔

یہ صورتِ حال ہماری تواریخ کا صرف ایک ہی رخ پیش کرتی ہے۔ جو بدنیت کھلاڑیوں کے اپنے قانون کے تابع رہا۔ مگر اس تواریخ کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ جو کائنات کو چلانے والے خدائی قانون کے تابع ہے۔ وہی خدائی قانون جو تازہ کاٹی ہوئی گیلی اور کمزور لکڑی پر دھوپ، بارش، سردی، گرمی، آندھی اور طوفان کے تھپیڑے مار مار کر اس کی اس حد تک پختہ کاری یا سیزننگ (Seasoning) کرتا ہے کہ یہ بلند و بالا عمارتیں کھڑی کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ چھ صدیوں سے مسلم اُمہ کے مسلسل جمود کا المناک منظر دیکھنے والا خدا اقبال کی آہِ سحر گاہی اور نالۂ نیم شبی بھی سنتا رہا تھا کہ

حقیقت روایات میں کھو گئی
یہ اُمت خرافات میں کھو گئی

اس لیے خدائے تعالیٰ کو خوب اندازہ تھا کہ قائداعظم کی فہم و فراست ایک نیا ملک تو حاصل کرے گی مگر صدیوں پرانے زنگ خوردہ Self Oxide سے کھوکھلی قوم اسے چلا نہیں سکے گی۔ اس لیے اسے ویسی ہی Seasoning کی ضرورت ہے۔ جیسی اس برعظیم میں ہندو قوم کی 1947ء سے پہلے ہو چکی تھی۔ جب انہیں عرصہ دراز تک بیرونی حاکموں کی مسلسل غلامی میں رکھا گیا۔ چنانچہ پاکستانیوں کی Seasoning 1947ء کے بعد شروع ہوئی۔ جس کے لیے انہیں اندرونی اتحادِ ثلاثہ کی مسلسل غلامی کے حوالے کر دیا گیا اور اب نصف صدی کی پختہ کاری کے بعد ہماری قوم صرف اس قابل ہوئی ہے کہ شیر خوار بچے کی طرح لڑکھڑاتی چال چل سکے اور توتلی زبان سے اظہارِ مدعا کر سکے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ پختہ کاری کی اس نصف صدی میں حاکموں کا جور و استبداد بتدریج بڑھتا رہا پہلے ترقی پسند تحریک پر پابندی۔ پھر نیشنل پریس ٹرسٹ کے قیام سے قلم کی چال پر کنٹرول۔ پھر سیفٹی ایکٹ اور قلعہ اٹک کی کال کوٹھڑی۔ اگلے مرحلے پر قومی ترانوں کے ساتھ کوڑے اور بالآخر لاپتہ افراد۔ پہلے چند ایک پھر ہزاروں مگر ساتھ ہی ساتھ اس مظلوم و مقہور قوم کی سیزننگ (Seasoning) میں بھی بتدریج یہ مدارج دیکھنے میں آئے کہ پہلے قلم کا ڈھکا چھپا احتجاج پھر سرگوشیاں پھر زیرِ لب تبصرے، پھر بلند نعرے، جلسے جلوس، آزاد عدلیہ کے لیے وکلاء اور قوم کی تحریک اور بالآخر دھرنے یعنی انفرادی دھرنے، اجتماعی دھرنے اور باد و باراں کے طوفان میں دھرنے۔ اسی دوران میں سپریم کورٹ، میڈیا اور سول سوسائٹی کی طرف سے وڈیروں اور خفیہ اداروں کی نجی جیلوں پر اس طرح انگشت نمائی ہونے لگی کہ پچھلے تین چار برس میں خیر و شر کے درمیان کھلی جنگ چھڑ گئی۔ جو اس خلفشار کی موجودہ شکل ہے۔

اس جنگ کا آئندہ نتیجہ تو خدا ہی جانے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں ہمارے ادیب نے نہ تو قوم کی Seasoning کے عمل میں ہاتھ بٹایا اور نہ ہی اب خیر و شر کی اس جنگ میں شامل نظر آتا ہے۔ سوائے تین چار بکھری ہوئی انفرادی آوازوں کے جن میں سے ایک تو فیض احمد فیض کی دھیمی مگر مسلسل آواز ہے۔ دوسری حبیب جالب کی پرشور اور ہیجان انگیز آواز ہے اور تیسری احمد فراز کی سدا بہار رومانی آواز میں سے کبھی کبھار اُبھرنے والی احتجاجی دہائی ہے۔ چوتھی مثال احمد ندیم قاسمی کی ہے۔ جن کی آواز اور عمل دونوں ہی اپنے اپنے وقت پر سنجیدگی اور سلیقے سے بولتے رہے۔ احتجاج تو دیگر ادیبوں نے بھی کیا ہے۔ مگر اتنے محتاط انداز میں کہ وہ کسی کے کان کھڑے کر دینے والی آواز نہ بن سکے۔ جب تکیے میں منہ چھپا کر روئیں تو احتجاج کیسا؟

ع ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور.....

ان کے علاوہ مزاحمتی ادب کے نام پر موٹے موٹے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں لیکن ان میں شر کے خلاف خیر کی اصولی اور آفاقی مزاحمت نہیں ہے۔ بلکہ ایک سیاسی پارٹی کے ادیبوں کی اپنی مخالف سیاسی پارٹی پر تو نقطہ چینی ہوتی ہے۔ مگر اپنی سیاسی پارٹی کے ویسے ہی طرزِ عمل پر وہ بالکل خاموش اور لاتعلق رہتے ہیں۔ ایسے مزاحمتی ادب کا قاری صرف یہی کہہ سکتا ہے کہ

ع تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

آج کی اس محفل میں جو چند چہرے میرے ہم عمر ہیں انہیں یاد ہوگا کہ موجودہ قومی خلفشار سے پہلے کارخانہ پاکستان کا سنہری دور تھا۔ کہنے کو تو بقولِ غالب ہمارے گھر میں بوریہ بھی نہ تھا۔ مگر اس بے آب و گیاہ ویرانے میں ہی قوم نے چند برسوں میں گلشن مہکا دیے۔ ریلوے قابلِ فخر ادارہ بن گئی۔ پی آئی اے پیدا ہوا تو مختصر ترین بچپن کے بعد ایک جوان رعنا بنا کہ دوسرے ممالک میں جا کر کئی فضائی کمپنیوں کو جنم دیا۔ یہی معجزہ بینکاری نے دکھایا۔ واپڈا کا جوش نمو دیکھ کر ورلڈ بنک اسے سلام کرتا تھا۔ تھل کے تپتے صحراؤں میں گلزارِ ابراہیم کی طرح جوہر آباد اُبھر آیا۔ گلیوں میں کھیلنے والے کرکٹ اور ہاکی کے عالمی آسمان پر تارے بن کر چمکنے لگے اور سکولوں میں ٹاٹ

پر پڑھنے والے لڑکوں نے آگے چل کر ایٹم بم بنا دیے۔ مگر اس مختصر سے سنہری دور کے بعد ۱۹۵۸ء میں وہ پہلی لہر اُٹھی جس کی ہر کروٹ بعد ازاں قومی خلفشار کی نصف صدی میں ڈھلتی گئی اس لہر کی وجہ سے پہلے تو سنہری دور کے اچھے انتظامی ڈھانچے کے بخیے ادھڑنے لگے۔ پھر بری گورننس (Governance) کی نت نئی ایجادیں آنے لگیں جن سے آئین وقوانین ٹوٹے۔ پرانی اقدار ٹوٹیں، عوامی خواب ٹوٹے، قومی اُمنگیں ٹوٹیں اور ملک ٹوٹا۔ غرض سب کچھ ٹوٹتا رہا۔ صرف دو چیزیں نہیں ٹوٹیں۔ ایک تو اتحادِ ثلاثہ نہیں ٹوٹا اور دوسرے بڑھتے ہوئے قومی خلفشار کی شدت نہیں ٹوٹی۔ ان دونوں نے وطن کو جو کچھ دیا اس کے اظہار کے لیے صرف ایک ہی لفظ ہے یعنی ''موت'' جو کسی نہ کسی شکل میں نصف صدی سے اپنے پر ہر طرف پھیلا رہی ہے۔ مثلاً اقتدار کے ایوانوں میں آئین اور دستور کی موت۔ عوام کے گرد و پیش امن اور قانون کی موت۔ دھماکوں سے شہر کے سکون کی موت، سیاست میں اخلاقیات اور اصولوں کی موت، ریاستی اداروں میں ضابطوں اور کارروائی کی موت اور دنیا بھر میں پاکستانی سبز پرچم اور سبز پاسپورٹ کے وقار کی موت۔

یہ صورتِ حال بلاشبہ ایک قومی المیہ ہے۔ مگر عظیم تر المیہ یہ ہے کہ ہمارے ادب میں اس کی متناسب عکاسی اس طرح نہیں ہوئی۔ جس طرح ہونا چاہیے تھی۔ ہمارے ادیب کا قلم قوم کے نڈھال چہرے پر بہنے والے آنسوؤں کا شمار تو کرتا رہا ہے۔ مگر ان آنسوؤں کو پیدا کرنے والی پس پردہ قوتوں کی شناخت، افشاء، تشہیر اور مذمت میں یہ قلم کبڑا، الفاظ لنگڑے اور زبان گنگ ہو جاتی رہی۔ اسی لیے ڈاکٹر طاہر تونسوی نے کہا:

یہ دورِ اہلِ قلم پہ بھاری کہ مصلحت کی سبیل جاری
گناہ کو بھی ثواب کہنا، ببول کو بھی گلاب کہنا

چنانچہ گزشتہ سانحوں پر مرثیے لکھنے کی خانہ پری تو ہوتی رہی۔ مگر پیش بندی کی کوئی تحریک چلا کر آئندہ سانحوں کا راستہ روکنے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی۔ حیف یہ ہے کہ خیر و شر کی موجودہ جنگ میں حصہ لینے کے لیے ہمارا ادیب ادب بھی کمر بستہ نہیں ہے اور سیاست کا ذکر ہوتے ہی وہ ادب کا گھونگھٹ اوڑھ لیتا ہے کہ ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔ ماضی میں رائٹرز گلڈ اور حال میں دیگر سرکاری ادبی اداروں کی مراعات کی گود میں پلنے والا ادیب سیاست کے نام پر بہو بیٹیوں کی طرح شرم سے لال تو ہو سکتا ہے مگر قوم و ملک کو تباہ کرنے والی قوتوں کی کارکردگی پر نہ تو شرمندہ ہوتا ہے نہ غصہ کھاتا ہے اور نہ ہی کلمہ حق کہنے والا جہاد کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ چالیس برس پہلے ۱۹۷۱ء میں ملک کے دو ٹکڑے ہوئے۔ چھبیس برس تک حمود الرحمان کمیشن کی رپورٹ زندہ درگور رہی۔ پھر بیسویں صدی کے آخری دن لنگڑے انداز میں برآمد ہوئے بھی اب تیرہ برس گزر چکے ہیں (۹) مگر اس دوران کتنے ادبی قلم امام حکومتوں کی اس قومی بددیانتی کے متعلق حرکت میں آئے؟ بے حسی کا یہ رویہ ادب کی صریحاً بے ادبی کرتا ہے۔ کیونکہ ادب کی تقدیس ہی یہی ہے کہ وہ عصری زندگی کی عکاسی کرے۔

آخر میں اس ساری بحث کو مناسب انداز میں سمیٹنے کے لیے میں صرف چند مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان ادیبوں کی جنہوں نے ادیب کا فرض پورا کیا۔ ادب کا حق ادا کیا اور عصری زندگی کی عکاسی کی۔

پہلی مثال انگلستان کی Fabian Society کی ہے جو ۱۸۸۴ء میں چند اہل قلم نے معاشرے کو بتدریج بہتر کرنے کے لیے بنائی۔ آزادئ اظہار کے تحت سوسائٹی کے ہر ممبر کو اپنی بے لاگ تحریر پیش کرنے کا حق تھا۔ مگر نتائج بھگتنے کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی اور سوسائٹی ذمہ دار نہ تھی۔ اس طرح مذہب اور سیاست سمیت زندگی کے ہر شعبے پر مضامین پڑھے جانے لگے اور اندرونی بحث کے بعد قومی سطح پر شائع کیے جاتے تھے۔ اپنے اپنے وقت پر جارج برنارڈ شا، گراہام ویلیس اور ایچ جی ویلز (George Bernard Shaw, Graham Wallace, H.G.Wells) اور کئی دیگر ادیب اپنی آہستہ خرامی سے معاشرے کو بہتر بنانے میں مصروف رہے۔ حتیٰ کہ جب انگلستان میں لیبر پارٹی (Labour Party) کی بنیاد رکھی گئی تو اس کا آئین Fabian Society نے بنایا اور دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد 1945ء میں برٹش پارلیمنٹ کے 229 ممبران Fabian Society کے بھی ممبر تھے۔ آج اگر انگلستان ایک فلاحی ریاست ہے تو اس میں اس سوسائٹی کی سوچ اور عمل کا بہت دخل ہے۔

دوسری مثال الجیریا کے البرٹ کامیو (Albert Camus) کی ہے جس نے دوسری جنگ عظیم میں مفتوحہ علاقوں میں ہر چہار منڈلانے والی موت کو اپنے علامتی ناول The Plague میں ریکارڈ کیا اور خود عملی طور پر فرانس میں جا کر نازی جرمنی کے قبضے کے خلاف مدافعتی تحریک The Resistence میں سرگرم رہا۔

تیسری مثال ژاں پال سارتر (Jean Paul Sartre) کی ہے جس نے اہل قلم کا گروپ تیار کیا۔ البرٹ کامیو کے ساتھ مل کر خفیہ اخبار جاری کیا اور The Resistence تحریک میں بہت سرگرم رہا۔ جنگ کے بعد فرانس کی سرکاری پالیسی کے برعکس مارکسیت کا اتنا کھلا نقیب بنا کہ 1964 میں نوبل پرائز لینے سے انکار کر دیا۔ مگر بعد میں روس کی پالیسیوں اور ہنگری پر قبضے کے بعد اس نے مارکسیت چھوڑنے کا اعلان کیا اور الجیریا کی جنگ آزادی کے زمانے میں اپنے ہی ملک فرانس کے خلاف آواز اُٹھاتا رہا۔

آخری مثال میلان کنڈیرا (Milan Kundera) کی ہے جس کے وطن چیکوسلواکیہ پر روس کے قبضے کے بعد اس کی ساری کتابیں ضبط کر لی گئیں۔ جلاوطنی کے دنوں میں لکھے ناول کے انگریزی ترجمے (Life is Elsewhere) کے دیباچے میں وہ لکھتا ہے ''میں نے وہ خون آشام دور حکومت بڑے قریب سے اور اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جب شاعر اور جلاد دوستانہ انداز میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہوتے تھے۔ ایک جلاد جب سر کاٹتا ہے تو اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ کیونکہ سر کاٹنا اس کا پیشہ ہے مگر جب اس کے مہلک وار کی سنگت میں ایک شاعر دست قاتل کا قصیدہ گاتا ہے تو وہ ساری اقدار دھڑام سے نیچے آن گرتی ہیں جنہیں ہم مقدس سمجھتے ہیں۔''

صدر گرامی! اس طویل تمہید کے بعد مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ہمارے خلفشار زدہ معاشرے میں ادیبوں کے احتجاج کی آوازیں کم کم ہیں۔ مگر ان کے طرزِ عمل سے اُٹھنے والی دھڑام دھڑام کی آوازیں بہت زیادہ ہیں۔

(روزنامہ ایکسپریس کے زیر اہتمام اردو کانفرنس میں اس تحریر کا بیشتر حصہ پڑھا گیا۔ لاہور مورخہ ۱۲ اور ۱۳ر اکتوبر ۲۰۱۳ء)

حواشی:

(۱) صفحہ 148-1982 ایڈیشن Reconstruction of Religious Thought in Islam سر محمد اقبال

(۲) (مطبع) قائداعظم محمد علی جناح، حکومت پاکستان 1989 ایڈیشن، صفحہ 265- Speeches and Statements as Governor of Pakistan 1947-1948

(۳،۴) حسن ظہیر، 1995 ایڈیشن، صفحہ 61 Separation of East Pakistan

(۵) حسن ظہیر، صفحہ xix دیباچہ..... اگست 1947 سے اکتوبر 1954 کے دوران دستور ساز اسمبلی کے صرف پندرہ اجلاس ہوئے۔ جن کا مجموعی دورانیہ محض 116 دن تھا۔

(۶) تاریخ کا سفر، جلیل قریشی، 2013 ایڈیشن، صفحہ 22

(۷) جلیل قریشی، صفحہ 20

(۸) National Reconciliation Ordinance اور National Accountability Bureau

(۹) چہرے اور مہرے، مسعود مفتی، 2011 ایڈیشن- صفحات 121,6 اور 122

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

اساں دل نوں مرشد جان لیا

عامر بن علی

پنجابی اور اردو زبان کے مقبول شاعر، کالم نویس، مزاح نگار اور براڈ کاسٹر ابرار ندیم کا تازہ شعری مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ''اساں دل نوں مرشد جان لیا'' ان کے شعری سفر کا تیسرا پڑاؤ ہے۔ اس شعری مجموعے میں بھی ان کا منفرد اسلوب نمایاں ہے، وہ بھیڑ کے ساتھ چلنے والا تخلیق کار نہیں ہے اور نہ ہی شعروسخن کی دنیا میں پائی جانے والی موضوعاتی بھیڑ چال کا قائل نظر آتا ہے۔ دو دہائیاں پہلے ابرار نے زمانہ طالب علمی میں ہماری پہلی ملاقات کے دوران یہ شعر سنایا تھا جو آج بھی یاد ہے کہ

چنگے طور طریقے چھڈ کے زہری ہندے جاندے نے
ہولی ہولی پنڈاں والے شہری ہندے جاندے نے

کمال یہ ہے کہ ابرار نے زندگی کا بیشتر حصہ شہر میں گزارنے کے باوجود خود پر شہر کا رنگ نہیں چڑھنے دیا۔ مضافاتی گرم جوشی اور خلوص آج بھی اس کی شخصیت کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ اچھا شاعر ہونا بلا شبہ ایک خوبی ہے مگر اچھا انسان ہونا میرے نزدیک اس سے بڑی اور بنیادی خوبی ہے۔ وقت اور تجربے نے یہ چیز سکھائی ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ ہر اچھا فنکار، اچھا انسان بھی ہو۔ فنکاروں کا فن اور شخصیت ایک ہی سمت میں ہمیشہ نہیں ہوتے ہیں۔ مگر ہونا تو ایسا ہی چاہیئے کہ ہم جس چیز کا پرچار کرتے ہیں وہ محاسن ہماری ذات کا بھی حصہ ہوں۔ ہم شاعر لوگ اپنی شاعری میں جس وفا کی طلب اور اعلیٰ اخلاقی رویوں کا تقاضا کرتے ہیں وہ خوبیاں ہماری شخصیت میں بھی نظر آنی چاہئیں۔ ابرار ندیم کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس کا فن اور شخصیت ایک جیسے ہیں۔ وہ جن اخلاقی خوبیوں کا سماج سے متمنی ہے خود ان کی عملی تفسیر بھی ہے۔ اپنی شاعری کی طرح اجلا اجلا، نکھرا نکھرا، تصنع اور بناوٹ سے پاک۔

آج کل تصوف اور درویشی کے الفاظ کثرت استعمال کے سبب اپنے معنی و مطالب کھوتے جا رہے ہیں۔ شعروسخن میں مگر آج بھی صوفیانہ رنگ اپنے اصلی گوڑھے رنگ میں نظر آتا ہے۔ بلھے شاہؒ کے الفاظ میں

جو رنگ رنگیا، گوڑھا رنگیا

ابرار ندیم کلاسیکی شاعری کی اسی خوبصورت روایت کا امین ہے جس میں عشق حقیقی کو مجاز کے پیراہن میں پیش کیا جاتا ہے۔ سنا ہے کہ سنگ مرمر میں کوئی پودا نہیں اگ سکتا ماسوائے زیتون کے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زیتون کی جڑیں اتنی باریک اور فائن ہوتی ہیں کہ سنگ مرمر کو احساس ہی نہیں ہوتا اور وہ اس کے اندر داخل ہو جاتی ہیں۔ سنگ مرمر کے مسامی پتھر کے اندر جس طرح زیتون کی جڑیں داخل ہوتی ہیں، برصغیر میں صوفیاء کرام کی شاعری نے بھی وہی کام ہمارے دلوں کے ساتھ کیا ہے۔ ابرار ندیم کی شاعری بھی ایسی ہی شاعری ہے، دلوں میں گھر کر جانے والی۔ ہم سنگ دل دنیاداروں کو انسانیت کا احساس دلانے والی۔

بیج اور کنکر میں بنیادی فرق جوش نمو کا ہے۔ جو دھرتی کا سینہ چیر کر نکلے، وہ بیج ہے۔ سچے تخلیق کار کی مثال بیج جیسی ہے۔ جو نمو پا کر سماج کو سایہ اور پھل دیتا ہے۔ جو فنکار معاشرے کو سایہ اور پھل فراہم نہ کر سکے وہ جوش نمو سے عاری کنکر کی مانند ہے۔ استاد دامن نے شاعر کی بڑی خوبصورت تعریف کی ہے۔

میرے خیال اندر اوہ شاعر ہندا
جیہڑا کھنڈ نوں کھنڈ تے زہر نوں زہر آکھے
جیہڑا ندی نوں ندی تے نہر نوں نہر آکھے

''اساں دل نوں مرشد جان لیا'' کی شاعری استاد دامن کے قائم کردہ اس معیار پر حرف بہ حرف پوری اترتی ہے۔ آزادی اظہار پر دن بدن بڑھتی ہوئی دیدہ و نادیدہ پابندیوں کے سبب شاعری کا سکوپ مزید بڑھتا جا رہا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میرے پیر بھائی گلِ نوخیز اختر نے مجھ سے پوچھا کہ میں شاعری کیوں کرتا ہوں؟ تو میرا جواب تھا کہ شاید سچ بولنے کا ہمارے ملک میں اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ ابرار ندیم کہتے ہیں کہ

تن دا ماس کھوائی رکھنا سوکھا نئیں
درداں نال بنائی رکھنا سوکھا نئیں
اج وی اوہدے ناں تے اڑیاں کردا ے
کملا من پرچائی رکھنا سوکھا نئیں

اور شعر ملاحظہ فرمایئے گا کہ

دوتن قسماں تے کجھ سفنے
اینے دے وچ آندا کیہ اے

میری یہ خواہش اور دعا ہے کہ دلوں کو موم کرنے والی ابرار ندیم کی شاعری کی یہ رم جھم جاری رہے۔

کتاب کا خوبصورت سرورق ضیاء انجم نے بنایا ہے اور اسے الخیال پبلشرز نے لاہور سے شائع کیا ہے۔ اعلیٰ طباعت سے مزین 160 صفحات کی اس کتاب کی قیمت تین صد روپے ہے۔ جو کہ اس مہنگائی کے دور میں مناسب ہے۔ عہد حاضر کے نامور شعراء کرام کی آراء کو بھی شاملِ اشاعت کیا گیا ہے جن میں عطاء الحق قاسمی کی رائے بیرونی ٹائٹل پر موجود ہے جبکہ اندرونی صفحات پر منیر نیازی، یونس احقر، عباس تابش، ڈاکٹر ناصر رانا، جمشید مسرور، محمد احسن راجہ، سعد اللہ شاہ ڈاکٹر جواز جعفری کے علاوہ فوزیہ بھٹی کی آراء بھی شامل ہے۔ کتاب میں نظموں اور غزلوں کے علاوہ قطعات اور فردیات بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ اساں دل نوں مرشد جان لیا پنجابی ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

اقبال رہنما

پروفیسر عاشق رحیلؔ/لاہور

اقبال راہی صاحب ''راہی'' اُس وقت تھے جب انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور حضرت احسان دانش نے ان میں شاعری کی صلاحیت بھانپتے ہوئے انہیں ''شاہراہ شاعری'' پر پہنچا کر سوئے منزل گامزن کیا ہوگا۔ ہر راہی کے سامنے کوئی نہ کوئی منزل ہوتی ہے جس پر کامیابی سے پہنچنا اُس کا نصب العین ہوتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ منزل تک پہنچنے کے لیے راستے میں ہزاروں رکاوٹیں آتی ہیں جن کو ہٹانا یا جن سے دامن بچا کر چلنا ہر راہی کا اپنا اپنا طریقہ اور اپنی اپنی ہمت ہوتی ہے۔ منزل کے حصول کے لیے فریب نظر سے بھی بہت واسطہ پڑتا ہے اور راستہ روکنے اور منزل سے گمراہ کرنے والے بھی اپنی اپنی کوشش کرتے ہیں لیکن دائیں بائیں دیکھے بغیر، ہر بظاہر دل فریب منظر سے آنکھیں چرا کر اپنی لگن میں راہِ راست پر چلتے رہنے میں ہی کامیابی کا راز پنہاں ہوتا ہے۔ اقبال راہی صاحب بھی ایسے ہی راہی ثابت ہوئے جن کے راستے میں دکھوں، تکلیفوں، محرومیوں کا ایک طوفان پیش آیا لیکن ہمارے اس راہی نے ان سب کی پروا کیے بغیر ان سب کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ اپنے قدموں کے نشان اور ان کی دھول پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے ہی آگے چلتے رہے۔

اب اقبال راہی صاحب اپنے نام کے ساتھ ''راہی'' لکھ کر سرنفسی سے کام لے رہے ہیں۔ کیونکہ اب وہ راہی نہیں رہے بلکہ رہنما بن چکے ہیں۔ میرے ایسے کئی گمشدہ راہیوں کی رہنمائی کے لیے انہیں ان کی منزل تک پہنچانے کا کارنامہ سرانجام دے چکے ہیں اور دے رہے ہیں۔ وہ آبِ شیریں کے ایک ایسے چشمے کا کام دے رہے ہیں جو ان گنت تشنگانِ ادب کی پیاس بجھانے اور ان کی راہوں کو آسان بنانے میں مدد دے رہے ہیں۔ اس راہی نے اپنے قدموں کے نشانات سے ایک پگڈنڈی بنائی پھر اس پگڈنڈی نے جرنیلی سڑک کا روپ دھار لیا جس پر ''کارواں شاعراں'' آسانی سے رواں دواں رہتا ہے۔

بطور انسان بھی اقبال راہی صاحب بہت سی خوبیوں کے حامل ہیں۔ انکساری، ملنساری اور دلداری اُن کی طبیعت کا خاصہ ہیں۔ وہ خود دلدار ہیں اور چھوٹے بڑے ہر ایک انسان کے دل کا خیال رکھتے ہیں۔ میری ان سے پینتیس سالہ رفاقت چلی آ رہی ہے۔ میں نے انہیں ہمیشہ ہر قسم کے انسانوں سے خندہ پیشانی سے پیش ہوتے اور بے لوث خدمت کرتے ہوئے پایا۔ میرے گھر میں میرے پاس بیٹھے ہوں تو ان کے موبائل کی بیل مسلسل بج رہی ہوتی ہے اور سب کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ان کی تشفی کر رہے ہوتے ہیں۔ میں ان کے گھر ان کے پاس جاؤں تو انہیں بہت کم اکیلے پایا۔ یہ ان کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کی دلیل ہے۔

ان کو شاعر کے طور پر دیکھیں تو وہ کامیابی کی معراج پر ہیں۔ ان کے کلام کے معیار بارے دوسری بات ہی نہیں کی جا سکتی۔ وہ اپنے خیالات کو صفحہ قرطاس پر لانے کے لیے الفاظ کا ایسا انتخاب اور پیش کرنے کا ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ سننے یا پڑھنے والا عش عش کر اُٹھتا ہے۔ ان کا کلام افسردہ دلوں کی مسیحائی کا کام کرتا نظر آتا ہے۔ وہ روح کی غذا مہیا کرتے ہیں اور دلوں کو انبساط اور خوشی کی دولت فراواں سے مالا مال ہونے کا شرف بخشتے ہیں۔ جس شاعر کے کلام میں دل کی تاریں ہلا دینے والی تاثیر نہ ہو وہ محض الفاظ کا پلندہ ثابت ہوتا ہے لیکن اقبال راہی کی غزل یا نظم کا پہلا مصرعہ ہی قاری یا سامع کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور وہ ان کے کلام کے لفظ لفظ سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ان کلام سادگی مگر پرکاری، برجستگی اور معنی آفرینی کی بہترین مثال ہوتا ہے۔ نقادوں کی زبان میں اسے صنف سہل ممتنع کی بہترین مثال کہا جاتا ہے۔ یہ خوبی اور طبع کی موزونی ان کے لیے اللہ کی خاص نعمت ہے۔ ان کے کلام میں ایک لفظ یا ایک ترکیب بھی ایسی نہیں ہوتی جو سامع یا قاری کے سر پر سے گزر جائے وہ جب چاہیں جس موضوع پر چاہیں فی البدیہہ کلام پیش کر سکتے ہیں۔ یہ خوبی اللہ تعالیٰ کی دین ہے جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے پاکستان میں اس خوبی کے حامل دو ہی خوش نصیب شاعر تھے ایک کراچی میں جناب راغب مراد آبادی اور دوسرے لاہور میں ہمارے پیارے دوست اور ہر دلعزیز شاعر جناب اقبال راہی، راغب مراد آبادی صاحب کا کلام تو نہ میں نے سنا اور نہ پڑھنے کا موقع ملا لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ اقبال راہی صاحب کے ہم پلہ نہیں تھے۔ وہ کبھی کبھی تک بندی اور محض قافیہ پیمائی کے مرتکب بھی ہو جاتے تھے۔ راغب مراد آبادی صاحب تو کچھ سال پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اب راہی صاحب اس میدان میں یکتا اور منفرد ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں لمبی عمر عطا فرمائے تاکہ ان کا فیض دیر تک جاری رہ سکے اور وہ شاعری کے پیاسوں کے لیے میٹھے اور شفاف پانی کا چشمہ ثابت ہوتے رہیں۔

اکثر شاعروں کی طرح وہ دنیا سے اور اس میں روز روز ہونے والے واقعات سے کٹ کر رہنے والے شاعر نہیں وہ اپنے معاشرے کے نشیب و فراز، بین الاقوامی واقعات اور ملکی سیاست میں ہونے والی بداعتدالیوں، تبدیلیوں، ہمارے رہنماؤں کے کارناموں اور قول و فعل میں منافقت سے باخوبی آگاہ رہتے ہیں اور اپنی یہ آگاہی قطعوں کی صورت میں ایک روزانہ اخبار کی زینت بناتے رہتے ہیں۔ ان قطعات کا ایک مجموعہ ''قطع برید''۔ دوسرا ''ہائی الرٹ پاکستان'' کے نام سے چھپ کر آپ کی نظروں سے گزر چکے ہیں۔ ''زندہ حروف'' غزلوں کا مجموعہ تھا جس کے حروف واقعی زندہ ثابت ہوئے اور اکثر ہماری زبان پر رہتے ہیں۔ اب وہ ''شل'' پیش کر رہے ہیں۔ آپ یقیناً اس کی پذیرائی کے منتظر ہوں گے۔

آپ ہی کا الاپ ہے صاحب

شہباز نیرؔ / لاہور

دو جہانوں کے دھنک رنگوں سے مل کر بننے والی یہ کائنات، لحنِ حضرت داؤدؑ میں ڈھلا ایک الاپ ہی تو ہے۔ وہ الاپ جس میں عقیدت کے سات سُر مل کر عشق کی سرگم بناتے ہیں تو اہلِ صفا، اہلِ دل اور صاحب نظر حق کی تلاش میں شام و سحر کی ریاضت کو عبادت شمار کرتے ہیں۔

حق باری تعالیٰ کو ہر ایک سُر، راگ، راگنی، تال، مُرکی اور ہر حرکت میں محسوس کرتے ہیں۔ سب کا زاویۂ نظر اپنا اپنا سہی۔ سب کی رسائی کا معیار اپنا اپنا سہی مگر تمام مخلوقات اور ساری کائنات اس خالق کی حمد وثنا اور خواہش دیدار سے سرشار ہے۔

انہی دید کے دیوانوں اور حق کے متلاشیوں میں ایک ہیں جدید اُردو غزل کے منفرد شاعر جناب حسن عباسی۔ انہوں نے عقیدت اور برکت کے لیے ایک حمد اور ایک نعت ہی نہیں کہی بلکہ ثنائے ربِ ہر دو جہاں میں ''سائیں'' کے نام سے حمد یہ مجموعہ شائع کیا اور پھر ''صاحب'' کے عنوان سے دوسرا حمد یہ شعری مجموعہ منظرِ عام پر لائے۔ اور کمالِ فن یوں دکھایا کہ پوری کتاب کی ردیف ''صاحب'' کو بنا دیا اور صاحب سے مراد خدائے بزرگ و برتر ہے۔

حسن عباسی نے اپنے نظریۂ حیات اس کتاب کے موضوعات اور خیالات کو اپنے ایک شعر میں سمیٹتے ہوئے ربِ کریم سے دست بستہ عرض کی:

دل پہ کوئی بھی تھاپ ہے صاحب
آپ ہی کا الاپ ہے صاحب

اس سے پہلے حسن عباسی نے غزل کے آنگن میں اشعار کی ایسی ساحرانہ خوشبو بکھیری ہے کہ ان کے ہم عصر اور آئندگان ایوانِ غزل کے معطر محسوس کر رہے ہیں۔ ان کے اشعار میں نیا پن، نئی علامات، نئے زاویے اور ان کی ذات کا عکس یعنی سادگی بدرجہ اُتم موجود ہے۔ ان کے ہاں شدتِ احساس اور داخلی کیفیات کے انوکھے اور ندرت بھرے اظہار کو دیکھ کر کچھ عرصہ پہلے میں نے ان کے لیے کہا تھا کہ:

اُس کے سانسیں لیتے شعر جو سنتا ہوں
مجھ کو حسن عباسی پہ پیار آتا ہے

خیر یہ تو برسبیلِ تذکرہ بات کہہ دی۔ حسن عباسی ایک درویش صفت انسان ہیں۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ ان کے اندر درویش نے جب کروٹ لی تو انہوں نے اپنے چونکا دینے والے لہجے کے ساتھ حمد کے موضوع پر نہ صرف شعر موزوں کیے بلکہ پوری پوری کتابیں لکھیں اور شائع کر دیں اور یہ وہ موضوع ہے جس کا تعلق دنیا سے نہیں، دل سے ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت بھری مسرت دامن گیر ہوئی۔

حسن عباسی غزل سے حمد تک، جذبوں کی سچائی کو مصور کرنے والے اور قلبی کیفیات کو لفظوں سے منور کرنے والے باکمال شاعر ہیں۔

خدا کی محبت اور احساس کی شدت ان میں یوں مہک رہی ہے کہ انہیں دھڑکتے دل سے پرندوں کی چہکاروں تک ہر سُو رب کی نشانیاں ہی نظر آتی ہیں۔ انہیں لفظوں سے آوازوں تک ذکرِ معبودِ مصطفیٰؐ کی جلوہ نمائی کا احساس معطر کرتا ہے تو وہ کہتے ہیں:

شام کو پیڑوں میں کیا آپ نظر آتے ہیں
ختم نہیں ہوتیں چڑیوں کی باتیں صاحب

رقص، تصوف میں ایک ادا ہے۔ وجد کی کیفیت ہے، ایک راستہ ہے دیدِ یار تک رسائی کا۔ حضرت بابا بلھے شاہ اور حضرت مولانا روم کے عشق کی حدت اور رقص کی کیفیت ربِ رحمٰن سے رجوع کی ایک شکل ہے۔ یار کی خوشی کے حصول کے لیے ناچنا، اپنی ذات بھلانا، اپنا آپ گنوانا، ولیوں، صوفیوں کے لیے کسی عبادت سے کم نہیں رہا۔ حضرت سخی لعل شہباز قلندر کی فارسی غزل کا مطلع ملاحظہ فرمائیں۔

نمی دانم کہ آخر چوں دمِ دیدار می رقصم
مگر نازم بہ ایں ذوقِ کہ پیشِ یار می رقصم

اللہ والے سدا خوش نودیٔ یار میں خوش رہتے ہیں۔

حسن عباسی کی انسان دوستی خدا سے محبت اور مخلوقِ خدا سے رغبت و انس، صوفیوں کی صف میں ان کے ایک ادنیٰ خدمت گزار ہونے کی نشانی ہے۔ وہ بھی شادیٔ یار کے لیے رقص کناں ہیں۔ خواہش دیدار کی کسک میں برلب جاں ہیں اور نا اُمید نہیں۔ اسی اُمید اور بے قراری کو کیسا خوبصورت اظہار حسن عباسی نے دیا ہے۔ کہتے ہیں:

کس چکر میں آپ دکھائی دیں گے ہم کو
کب تک اپنی ایڑھی پر ہم گھومیں صاحب

ایڑھی پہ گھومتے گھومتے انسان دنیاداری میں کتنا گھوم کے رہ جاتا ہے۔ مگر حسن عباسی ''والعصر'' کے تناظر میں دنیا کو دیکھتے ہیں اور اس کے ظاہری فائدوں کی حقیقت کو سمجھتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

منافع ہم کو دیتے ہو خود اپنی جیب سے ورنہ
خسارہ ہی خسارہ ہے یہاں ہر کام میں صاحب

دنیا نفع و خسارہ کی بات اور فساد کو سمجھ چکنے کے بعد اپنے معاملات، روح اور جسم کی تطہیر کی خواہش کے زیرِ اثر یوں ملتجی ہوتے ہیں:

گلی سے اپنی گزار صاحب
چکانے ہیں کچھ ادھار صاحب

شعر کا شعور پا کر خود شناسی سے خدا شناسی کی طرف قدم بڑھاتے جنابِ حسن عباسی کو اللہ پاک اپنے کرم کے سائے میں یونہی شاد کام رکھے۔ آمین

بے باک شاعرہ.....فہمیدہ ریاض

ساحل سلہری/ سیالکوٹ

بے باک نسائی لہجے کی خوب صورت شاعرہ فہمیدہ ریاض ۱۹۴۵ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئیں، اوائل عمری میں شعری سفر کا آغاز کرنے والی اس شاعرہ کو جدید اردو شاعرات میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں ''پتھر کی زبان''، ''بدن دریدہ''، ''دھوپ''، ''کیا تم پورا چاند دیکھو گے؟''، ''ہم رکاب''، ''اپنا جرم ثابت ہے'' اور ''آدمی کی زندگی'' شامل ہیں۔ ان کی شاعری جسارت، بے باکی، بغاوت اور احتجاج کی حامل ہے۔ ان سے قبل شاعرات کے لہجے میں اس طرح جسارت اور بے باکی نظر نہیں آتی۔ اردو شاعرات میں احتجاج کرنے والوں میں فہمیدہ ریاض وہ شاعرہ ہیں جنھوں نے عورت میں احتجاج کی جرأت پیدا کی۔

فہمیدہ ریاض کے اولین شعری مجموعہ ''پتھر کی زبان'' کی نظموں میں ایک جوان لڑکی کو پیش آنے والے مسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ انھوں نے ایک لڑکی کی خواہش وصل، امید وبیم کی کیفیت، بے وفائی کا شکوہ اور نارسائی کے احساس کو اپنی ابتدائی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل زیادہ تر نظمیں رومانوی طرز احساس میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ نظم ''گڑیا'' اور ''پتھر کی زبان'' اس کی عمدہ مثالیں ہیں، آخرالذکر نظم میں عورت اور مرد کے ازلی رشتے اور عورت کی جانب سے وفا کی ریت نبھانے کی عکاسی کی گئی ہے:

اسی اکیلے پہاڑ پر تو مجھے ملا تھا
یہی بلندی ہے وصل تیرا
یہی ہے پتھر مری وفا کا
اُجاڑ، چٹیل، اداس، ویراں
مگر میں صدیوں سے اس سے لپٹی ہوئی کھڑی ہوں
پھٹی ہوئی اوڑھنی میں سانسیں تری سمیٹے
ہوا کے وحشی بہاؤ پر اڑ رہا ہے دامن
سنبھالا لیتی ہوں پتھروں کو گلے لگا کر
نکیلے پتھر
جو وقت کے ساتھ میرے سینے میں
اتنے گہرے اتر گئے ہیں
کہ میرے جیتے لہو سے سب
آس پاس رنگین ہو گیا ہے
مگر میں صدیوں سے اس سے لپٹی ہوئی کھڑی ہوں

اس نظم میں فہمیدہ نے نسوانی جذبات کی ترجمانی کی ہے کہ مرد عورت کو وصل کے بعد بھول گیا ہے لیکن عورت اسی جذبے سے محبت اور وفا کی پاسداری کر رہی ہے۔ اس نظم میں فکر ونظر کی بالیدگی اور لہجے کی سنجیدگی نظر آتی ہے۔ نظم ''گڑیا'' میں شاعرہ نے مرد کی ذہنیت کی عکاسی کی ہے کہ وہ کس طرح ایک کھلونے کی طرح بھولی بھالی لڑکیوں سے کھیلتے ہیں اور جی بھر جانے پر اس سے لاتعلق ہو جاتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح بچے کھلونوں سے کھیلتے کھیلتے دل بھر جانے کے بعد وہیں پڑے رہنے دیتے ہیں اور نیا کھلونا دیکھنے پر پرانے کھلونے میں کشش محسوس نہیں کرتے۔ مرد عورت کے جواں جسم سے پیار تو کرتا ہے مگر عشق کی خواہش کے سچے نسوانی جذبے سے بے خبر رہتا ہے، یہ نظم ان کی عصری حسیت کی مثال ہے:

چھوٹی سی ہے
اس لیے اچھی لگتی ہے
بٹوا جیسے ہونٹ ہیں اس کے
اور رخساروں پر سرخی ہے
نیلی آنکھیں کھولے، بیٹھی تاک رہی ہے
جب جی چاہے
کھیلو اس سے
الماری میں بند کر دو
اس کے ننھے لبوں پر کوئی پیاس نہیں ہے
نیلی آنکھوں کی حیرت سے مت گھبراؤ
اسے لٹا دو/ پھر جیسے یہ سو جائے گی

فہمیدہ ریاض نے اس نظم میں ایک عورت کی وفاداری کو منفرد انداز میں بیان کیا ہے اور مرد کی عورت سے متعلق ذہنیت پر سوالیہ نشان لگائے ہیں۔ ''ننھے لبوں کی پیاس'' اور ''نیلی آنکھیں'' دراصل نسوانی بے لوث عشق کی طلب کا علامتی اظہار ہیں۔ انھوں نے ان نظموں میں مرد کی خودغرضی کا ذکر کیا ہے، مرد سمجھتا ہے کہ شاید عورت اس کے منافقانہ رویے اور خودغرضی سے واقف نہیں، کم وبیش ہر عورت اس بات کو سمجھتی ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کر پاتی۔ فہمیدہ عورت کو معاشرے کا ایک اہم کردار سمجھتی ہیں وہ اس تصور کو یکسر رد کرتی ہے کہ عورت کا گوشت پوست سے بنا ہوا خوب صورت انسانی ڈھانچہ مرد کی جنسی آسودگی اور بچے پیدا کرنے کے لیے ہے۔ فہمیدہ نے اپنی شاعری میں مرد معاشرے کے رواجوں اور مردانہ روش اور ذہنیت پر طنز کی ہے۔ انھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مردانہ ذہنیت صنف نسواں کو جسم سے پرے

دیکھنے کی عادی نہیں۔ نظم ''بڑھتی ناؤ'' میں شاعرہ جب ایک جوان دوشیزہ کو گلے لگاتی ہے تو اس کے جسم کی اٹھان سے اس کی آنے والی زندگی کے بارے میں متعدد خدشات کا شکار ہو جاتی ہے۔ فہمیدہ کے خیال کے فطری پن اور لہجے کی بے ساختگی اس شعری اقتباس میں ملاحظہ کیجیے:

تجھ سے لپٹ کر، اے مری جان
ڈر سے سوکھ گئے مرے آنسو
سہم گئی مری مسکان
تجھ سے لپٹ کر میری دو بانہوں میں
سمائی ساگر کی بھرپور اٹھان!
دیکھو دیکھو ہر آنے والے پل میں کیا ہونے والا ہے
چار اور سے سرک رہے ہیں کالے، بوجھل، اندھے سائے

فہمیدہ ریاض کی نظمیں عورت کے حواس، جذبات و تجربات کی بے باکی کی سچی عکاس ہیں۔ انھوں نے مشرقی تہذیب و روایات سے دب جانے والی عورت کے جذبات کو کھول کر بیان کیا ہے۔ ان کی نظمیں ''باکرہ'' اور ''زمین دوز ریل'' عورت کے اَن کہے جذبوں کو زبان دیتی ہیں۔ عورت کے نقطۂ نظر سے پیوستہ نظموں میں ''بدن دریدہ''، ''ہاتھ اپنا لاؤ ذرا''، ''مقابلہ حسن اور الاؤ''، ''آکاس بیل''، ''دوجا سایہ''، ''لوری''، ''زمین زبانوں کا بوسہ''، ''وہ ایک زن ناپاک''، ''پچھلے پہر میں'' اور ''آج شب'' شامل ہیں۔ فہمیدہ ریاض نے ایک عورت کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کرنے پر احتجاج کیا ہے اور اسے سماج کا جبر گردانا ہے۔ انھوں نے معاشرے کی ایسی روش کو سخت ناپسند کیا ہے جس میں والدین اپنی بیٹیوں کی شادیاں ان کی مرضی کے مرد کے بجائے چند دنیاوی آسائشوں کی خاطر کسی رئیس گھرانے کے مرد سے کر دیتے ہیں۔ وہاں اسے چند سہولیات اور سامانِ آرائش تو مل جاتا ہے لیکن شوہر کا پیار نہیں ملتا۔ اس طرح عورت نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو کر گھٹن میں زندگی بسر کرتی ہے۔ عورت کی نفسیات اور جذبات کو عین فطرت کے مطابق شعری پیکر عطا کرنے میں فہمیدہ ریاض ایک کامیاب شاعرہ ہیں۔ فہمیدہ ریاض نے جہاں متنوع سماجی، سیاسی اور ملکی ہنگامی حالات و مسائل کو موضوع بنایا وہاں اُن انسانی رویوں کو ناپسند بھی کیا جن کی وجہ سے عورت عدم تحفظ اور استحصال کا شکار ہے۔ انھوں نے پدری نظام کے پیدا کردہ روایتی جبر کے خلاف مزاحمتی رویہ اپنایا اور مرد کے عورت سے متعلق منافقانہ رویے اور خود غرضی کے تصور کو یکسر رد کر دیا۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری مردانہ معاشرے سے مکالمہ، روحِ عصر، جسارت، بے باکی، بغاوت اور احتجاج سے ہم آمیز ہے۔

بہ یاد: سید قاسم محمود
Monthly Book Digest
بک ڈائجسٹ لاہور
ISSN 2079-4584
bookdigest@hotmail.com
kitabvirsa@gmail.com
مدیر اعلا: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ
صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

فروغِ ادب کے لیے وقف
براہِ کرم اپنی اردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری و نثر) کمپوز کروا کے ''ان پیج'' میں ای میل کر دیا کریں
bookdigest@hotmail.com

آپ اپنے مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ رسالے کے حصول کے لیے سالانہ زرِ تعاون مبلغ -/1000 روپے اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر بنام مظہر سلیم مجوکہ مدیر اعلیٰ ماہنامہ بک ڈائجسٹ، کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور کو ارسال کریں۔ رسالہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔

برائے خط کتابت/ ترسیل زر / رابطہ
بک ڈائجسٹ
کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
0333-4377794-042-37322996

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جیسے

عطاء الحق قاسمی

مرنا تو سب نے ہے لیکن میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ مشفق خواجہ بھی مر جائیں گے۔ ہم لوگ ساری عمر اپنی موت کے خوف میں گزار دیتے ہیں اور اپنے پیاروں کے بارے میں خود کو ذہنی طور پر تیار نہیں کرتے چنانچہ جب کبھی اس طرح کی کوئی خبر موصول ہوتی ہے تو ہمیں اندر سے ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ مشفق خواجہ کے دوستوں کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ شخص ابھی سے ان کا ساتھ چھوڑ جائے گا۔ میری ان سے فون پر اکثر بات ہوتی تھی۔ تقریباً دو ہفتے قبل بھی میں نے انہیں فون کیا تھا۔ وہ حسبِ معمول پھلجھڑیاں چھوڑتے رہے۔ میں اس روز زیادہ دیر ان سے بات نہ کر سکا کیونکہ مجھے کہیں جانے کی جلدی تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ انہیں مجھ سے زیادہ جانے کی جلدی ہے ورنہ چند گھڑیاں اور ان سے بات کر لیتا۔

مشفق خواجہ بہت بڑے محقق تھے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق میں ان کے پائے کا کوئی شخص فی الوقت پاکستان میں موجود نہیں۔ تحقیق اور تخلیق دو مختلف چیزیں ہیں۔ ان شعبوں سے منسلک افراد ایک دوسرے سے کچھ لاتعلق سے رہتے ہیں۔ محقق کو زندہ ادیبوں کے کلام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی کہ وہ تو گم شدہ میراث کی تلاش میں رہتا ہے اور تخلیق کار کو اس سے کوئی خاص غرض نہیں اگر کوئی مخطوطہ برآمد ہوتا ہے اور محقق کے حواشی کے ساتھ شائع ہو جاتا ہے لیکن مشفق خواجہ زندہ ادیبوں میں مقبول ترین شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک چلتی پھرتی ''کتابیات'' تھے۔ انہیں پتہ ہوتا تھا کہ کس ادیب کی کون سی کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ وہ کہاں سے مل سکتی ہے۔ نہایت خشک موضوع پر تحقیق کرنے والے مشفق خواجہ کی بذلہ سنجی برصغیر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مشہور تھی۔ ان کا ادبی کالم ''خامہ بگوش'' ہر ہفتے شائع ہوتا اور اس کی ایک ایک سطر میں چھپے طنز و مزاح کی خوشبو چاروں اور پھیل جاتی۔ انہوں نے ایک شاعر کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''اس کتاب میں ایک سو دس گرام کاغذ استعمال کیا گیا ہے جبکہ شاعری صرف دس گرام کی ہے'' ایسے جملے جس کے بارے میں ہوتے تھے وہ تلملاتا ضرور تھا مگر صبر سے کام لیتا تھا کہ اس نے سن رکھا تھا اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

خواجہ صاحب اگرچہ ''لاہوریئے'' تھے مگر مجید لاہوری کی طرح ان کی ساری عمر بھی کراچی میں بسر ہوئی۔ انہیں زبان کی صحت کے حوالے سے اتھارٹی سمجھا جاتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ زبان جاننے کے لیے اہلِ زبان ہونا نہیں اہلِ علم ہونا ضروری ہے اور مشفق خواجہ سے زیادہ صاحبِ علم کون ہوگا۔ میں نے چند ماہ قبل انڈیا جانے سے پہلے خواجہ صاحب کو فون پر بتایا کہ میں نے بنارس اور کلکتے کے ویزے کے لیے بھی اپلائی کیا ہے یہ سن کر خواجہ صاحب نے ان دونوں شہروں کی بڑی بڑی لائبریریوں اور وہاں کے صاحبِ علم حضرات کی پوری تفصیل میرے سامنے بیان کی اور کہا کہ موقع ملے تو وہاں ضرور جائیں اور ان صاحبانِ علم سے ملاقات بھی کریں مگر بھارتی سفارت خانے نے ان شہروں کا ویزا نہ دیا اور یوں میری اور خواجہ صاحب کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔

خواجہ صاحب کی شگفتہ بیانی کا یہ عالم تھا کہ ایک دن میں نے انہیں پوچھا کہ دوزخ مذکر ہے کہ مونث۔ بولے ہر دو صورتوں میں اس سے پناہ مانگنا چاہیے۔ پھر کہا ''میرا خیال ہے مونث ہے کیونکہ لوگ اس کے عذاب سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا ''خواجہ صاحب سنجیدگی سے بتائیں دوزخ مذکر ہے یا مونث'' بولے 'میرا خیال ہے کہ مونث ہے'' اس پر میں نے انہیں ہری چند اختر کا شعر سنایا جس میں انہوں نے دوزخ کو مذکر باندھا ہوا ہے۔ ہری چند اختر کا مصرعہ ہے ؎

جنابِ شیخ کو جنت ہمیں دوزخ عطا ہوگا

بولے ''اگر ہری چند اختر نے مذکر باندھا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ دوزخ کافروں کے لیے مذکر اور مسلمانوں کے لیے مونث ثابت ہوگا۔''

مشفق خواجہ معروف معنوں میں ''اسلام پسند'' تھے اور ''اسلام پسند'' جریدوں ہی میں کالم لکھتے رہے مگر وہ جتنے مقبول ''اسلامی'' حلقوں میں تھے شاید اتنے یا اس سے زیادہ مقبول ''غیر اسلامی''

حلقوں میں بھی تھے۔ یہ غالباً ان کے تبحر علمی کا رعب اور شوخیِ تحریر کا اعجاز تھا کہ انہیں ہر طرف سے دادِ سخن ملی۔ ان کے تحقیقی کارناموں کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی یا ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ہی گفتگو کا حق رکھتے ہیں لیکن ان کی شوخیِ تحریر کا کمال یہ تھا کہ ان کا طنز و مزاح بے پایاں علم میں رچا بسا ہوتا تھا۔ معلومات کا ایک ذخیرہ تھا جو ان کے فکاہی کالم میں نظر آتا تھا مگر ایک اچھے ''باورچی'' کی طرح وہ اپنا ادبی پکوان اس مہارت سے تیار کرتے کہ مرچ مصالحہ الگ تیرتا نظر نہیں آتا تھا بلکہ وہ پکوان کا حصہ بن کر اس کی لذت میں اضافہ کرتا تھا۔ علم اور طنز و مزاح کا یہ سنگم ہمارے ہاں کم کم ہی نظر آتا ہے۔

دُکھ صرف یہ نہیں کہ مشفق خواجہ فوت ہو گئے۔ دکھ تو یہ ہے کہ ایک ایک کر کے وہ سب لوگ اٹھتے جا رہے ہیں جن سے رونقِ بزم تھی۔ جن سے زیادہ خوبیوں کے حال لوگ تو ممکن ہے ہمارے درمیان موجود ہوں مگر اب ان جیسا کوئی اور نہیں۔ گزشتہ چند ماہ کے دوران اشفاق احمد، اعجاز حسین بٹالوی، حبیب اللہ اوج، حفیظ تائب، تابش دہلوی، احمد بشیر اور نواب مشتاق احمد خان ایک ایک کر کے ہم سے رخصت ہوتے چلے گئے۔ جو لوگ ان سے ملے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی وضع میں یکتا تھا چنانچہ ان کے چلے جانے سے مرحومین کا ذکر کیا ادب کے قاری ان میں سے نواب مشتاق احمد خاں کے نام سے واقف نہیں ہوں گے۔ خاں صاحب قاسم رضوی کے ساتھی تھے اور سقوطِ حیدر آباد (دکن) کے سانحہ کے چشم دید گواہ کی حیثیت سے انہوں نے ایک بہت دقیع کتاب بھی لکھی۔ ان کا انتقال گزشتہ ہفتے ماڈل ٹاؤن لاہور میں ایک سو تین سال کی عمر میں ہوا۔

سو اب ماتم صرف مشفق خواجہ کے جانے کا نہیں ایک پورے عہد کے آہستہ آہستہ رخصت ہونے کا ہے۔ اب صرف چند نشانیاں ہمارے پاس ہیں اور ہم لوگ ان کے حوالے سے نہ صرف یہ کہ کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ ہماری زبانیں بچھو کی طرح انہیں ڈستی رہتی ہیں۔ کاش جانے والوں کی جگہ لینے والا کوئی ہو ویسے مجھے تو آج تک موت کی سمجھ نہیں آئی۔ یہ ہمیشہ منتخب روزگار لوگوں ہی پر کیوں جھپٹتی ہے۔ خواجہ صاحب! ممکن ہو تو اس سے ضرور پوچھئے گا۔

❁❁❁

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140 روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350 روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200 روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200 روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700 روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150 روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700 روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800 روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200 روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400 روپے
تنقیدات حسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300 روپے
تحقیقی شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500 روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250 روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500 روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250 روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250 روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400 روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200 روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

مستنصر حسین تارڑ

سبوحہ خان

بعض دن کچھ اس طرح طلوع ہوتے ہیں کہ اس دن کے چند لمحے خوش آئند اور یادگار بن جاتے ہیں۔ ایسے لمحے جو آپ کو اتنا تروتازہ کر دیتے ہیں جیسے آپ اسی دن پیدا ہوئے ہوں۔ کیا معلوم تھا کہ اس دن چھما چھم بارش ہوگی اور اس بارش کے قطروں کو نمایاں کرتے ہوئے کبھی کبھی سورج کی کرنیں بھی اس سے گزریں گی جو ان قطروں کو قوس وقزح میں تبدیل کر دیں گی، ایسی قوس وقزح جو میری اپنی بالکل پرائیویٹ قوس وقزح ہوگی۔ کچھ ایسی ہی ایک دوپہر تھی، لاہور کی گیلی سڑکیں تھیں، لاہوری تھے جو ہم کراچی والوں کو تھوڑے سے پینڈو لگتے ہیں۔ اگرچہ۔۔اگر تھوڑی دیر ان سے بات کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کا بیرونی لبادہ اُن کے اندر کلچر کا کیا سینڈ seasoned خزانہ چھپائے ہوئے ہے اور کراچی والوں سے وہ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ۔۔اس سادگی پہ کراچی والو ہماری نہ جائیو.....اور عجیب بات یہ ہے کہ فیض گھر کے ایک انٹلیکچول سے زیادہ تعلیم اور فہم و دانش کا خزانہ گوالمنڈی کے کباب والے میں نظر آتا ہے۔ وہ صوفی کباب والا کہ جس کے کبابوں کی تعریف تو بہت مرتبہ سنی تھی اور تمنا تھی کہ جانے کب وہ کباب نصیب ہوں گے۔ خدا بھلا کرے میری بھتیجی رفعیہ کا کہ اس نے ایک بے حد سرد شام بلکہ رات میں مجھے صوفی کباب کھانے کی دعوت دی۔ بات پھر کراچی والوں پر آ گئی کہ کہاں کراچی والے اور کہاں جنوری کی شام میں لاہور کی سردی.....مگر صوفی کباب والے کے کبابوں کی گرمی نے جسم میں ایک حرارت پیدا کر دی.....تھرمل، سویٹر، موزے، شال اور نہ جانے کیا کیا پہن کر اندرون شہر لاہور میں داخل ہو گئے۔ میں نے سوچا خواہ مخواہ آ گئی اتنی پتلی پتلی گلیاں اور بے تکا ٹریفک۔ اور پھر نہ دوکان کے اندر کوئی بیٹھنے کی جگہ اور نہ باہر۔ مگر خدا خوش رکھے صوفی صاحب کو کہ انہوں نے ایک پتلا سا بنچ اپنے تندور کے متوازی ڈال کر ہمیں سر چھپانے کا ٹھکانہ دیا۔ ہم چھ لوگ گرم گرم شعلے نکلتے لال تندور کے سامنے بیٹھ گئے.....یہ تندور پاکستان جتنا نیا ہے اور اس کو چلانے والے پرانے صوفی صاحب امرتسر سے آئے تھے۔ اچانک آج کے صوفی صاحب نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا اور پوچھا: آپ لاہور میں رہتے ہیں؟ سوال جس طرح سے داغا گیا تھا اس سے مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا ایسا لگا جیسے کہہ رہے ہوں..... بادشاہو، نویں آئے ہو..... میں نے قدر آہستگی سے کہا.....نہیں.....کراچی میں.....اور پھر میری اور ان کی بات ایسے شروع ہوئی کہ لگتا تھا جانے کب کی آشنائی تھی۔ باقی سب لوگوں نے آپس میں باتیں کیں اور میں اور صوفی اپنی باتوں میں مگن ہو گئے۔ صوفی صاحب نے مجھ سے مولانا رومی اور شمس تبریز کی بات کی، خواجہ نظام الدین اور امیر خسرو کی بات کی، داتا صاحب کی بات کی، صوفی ازم پر ایسے بات کی جیسے وہ ان تمام کیفیات سے گزرے ہیں۔ علامہ اقبال اور فیض کے اشعار سنائے، اسی حوالے سے سیالکوٹ کی فضیلت کی بات کی.....کباب کیسے تھے یقیناً بہت لذیذ.....(رہے ہوں گے) مگر صوفی صاحب کی باتیں اس سے کہیں زیادہ دلآویز اور دلچسپ تھیں.....میں نے ان سے کہا آپ اتنا کچھ جانتے ہیں یقیناً مستنصر حسین تارڑ کو بھی جانتے ہوں گے.....کہنے لگے بالکل بالکل وہ کبھی کبھی تشریف لاتے ہیں۔ میں نے پوچھا آپکے پاس ان کا ٹیلیفون نمبر ہوگا؟ کہنے لگے نہیں.....مگر آخری بار وہ ایک ایس ایس پی صاحب کے ساتھ آئے تھے میں ان سے لے کر نمبر آپ کو دے سکتا ہوں.....آپ اپنا نمبر مجھے دے دیجیے.....یہ پہلی مرتبہ تھا کہ میں نے کسی کباب والے کو اپنا نمبر دیا ہو.....مگر خیر صحرا نوردی میں تو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے.....آپ سوچتے ہوں گے کہ میں بڑی رعونت پسند ہوں کہ اس طرح کہہ رہی ہوں جیسے کباب والے کو اپنا نمبر دینا میری شان کے خلاف ہے مگر بات کچھ یہ ہے کہ میری عمر میں بھی آ کر ہمارے ملک میں جو قیامت کے نامے ایس ایم ایس کے ذریعے آتے ہیں وہ دل کو تو خوشی سے لبریز کر دیتے ہیں.....مگر ساتھ ہی اپنی عمر کی وجہ سے اپنی بے مائیگی کا بھی احساس دلاتے ہیں.....اور خوف آتا ہے کہ کہیں پیغام بھیجنے والے کو ہماری اصلیت کی خبر نہ ہو جائے.....اور اگر خبر ہو گئی، تو جو تھوڑی بہت عزت سادات بچی ہے..... چلتے چلتے میں نے پوچھا: آپ کتنا پڑھے ہوئے ہیں؟ اپنی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے ایک دائرہ بنا کر کہا.....زیرو.....میں واقعی انگشت بدنداں تھی.....مگر یہ سننے کے بعد میں نے ان سے کہا آپ نے کچھ برا نہیں کیا کہ سکول نہیں گئے.....مگر پھر اتنی معلومات اتنا علم کہاں سے حاصل کیا؟.....کہنے لگے بس آپ جیسے عالموں کی صحبت کبھی کبھی ملتی رہی اور مجھ پر قدرت کے راز افشاء ہوتے رہے.....میرا سر ندامت سے جھک گیا کہ ہم جیسے لاعلم لوگ ان لوگوں کو اپنے سے کمتر جانتے ہیں۔ پھر بھی خود کو ان بڑے سیاستدانوں اور امراء سے بہتر جانا کہ کم از کم میں صوفی صاحب سے بات کر سکی.....ورنہ بڑے لوگوں کی آمد پر تو گلیاں اور شاہراہیں بند کر دی جاتی ہیں اور وہ بدقسمت بڑے لوگ جانتے ہی نہیں کہ ان گلیوں میں کیسے کیسے عالم اور صوفی بستے ہیں۔

اتفاق دیکھئے کہ میں نے کراچی میں راحت سعید سے کہا تھا کہ مجھے تارڑ صاحب کا نمبر دیں۔ میری کراچی کی فلائٹ سے پانچ گھنٹے پہلے ان کا فون آ گیا..... میری ملاقات تیار تھی (شکریہ راحت صاحب) ..... دس منٹ بعد پھر فون بجا اور صوفی صاحب نے بھی تارڑ صاحب کا نمبر دے دیا۔ واہ بھئی کیا بات ہے تارڑ صاحب کی.....اور میری قسمت کے ستارے کی کہ راوی نے چین ہی چین بلکہ عیش ہی عیش لکھ دیا..... فون کیا..... کیا میں ابھی آ سکتی ہوں جواب ملا ضرور ضرور تکلف کیسا..... مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ کہہ دیں کہ مصروف ہوں۔ تو بارش تیز برستی تھی.....ہوا تیز تھی.....مگر نہاں خانہ دل میں ملاقات کی خواہش نے گرمی ہی گرمی پیدا کر دی تھی۔ خواہش.....اور ایسی خواہش جو پچھلی چار دہائیوں سے .....دل میں پل رہی تھی۔ اور جس در پر جانے والی تھی اس کا اثر اتنا زیادہ تھا کہ میری ایک کتاب کا پہلا جملہ انہیں سے مستعار لیا گیا تھا کہ..... اگرچہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں.....تو اندازہ کیا جا سکتا ہے..... بلکہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ میرے پیر اس وقت زمین پر نہیں تھے۔

کئی مرتبہ خود کو سمجھایا بھی خود سے شرمندہ بھی ہوئی کہ میڈم اس عمر میں کسی سے ملاقات پر ایک ٹین ایجر کا جوش و خروش تمہیں زیب نہیں دیتا مگر دل کے ہاتھوں تو بڑے بڑے لوگ مجبور ہو جاتے ہیں۔ ارے پھر شوق دا کوئی مل نئیں۔ اور پھر ایک موقع کا شعر بھی یاد آ گیا کہ شاعروں نے اور شاعری کی کس لئے ہے.....اسی لئے کہ جہاں ضرورت ہو ان کو استعمال کیا جائے۔ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل..... لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے.....تو ہم نے پاسبان عقل کو ڈانٹا اور پھول لینے کے لئے لبرٹی کی طرف گاڑی کا رخ کروا دیا۔.....فلورسٹ پر بارش اور تیز ہو گئی۔ فردوس مارکیٹ کی طرف گاڑی موڑی۔ گھر کی نشانی تارڑ صاحب نے بہت اچھی بتائی تھی اور یہ نشانی وہی بتا سکتے تھے..... کہنے لگے کہ ایک پارک آئے گا، اس پارک کے سامنے بہت سے گھر ہیں، اس پارک میں جو سلائڈ لگی ہے جب بچہ سلائڈ پر بیٹھتا ہے تو اس کا رخ جس طرف ہوتا ہے وہی سامنے کا گیٹ میرا ہے.....نام بھی لکھا ہے۔ تو گھر ڈھونڈھنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ مگر دشواری یہ ہوئی کہ جب گیٹ پر پہنچے تو بارش اتنی تیز ہو گئی کہ سمجھ میں آ گیا کہ تیز بارش کو Raining like cats and dogs کیوں کہا گیا ہے۔ فون کیا کہ ہم آپ کے در پر آ چکے ہیں۔ ایک لڑکی نے گیٹ کھولا، گاڑی اندر لے جانے کے باوجود منزل مقصود یعنی ان کی لائبریری کے لئے کچھ چلنا پڑا۔ اس خوف سے کہ سرگیلا نہ ہو جائے..... میں نے پھولوں کے گلدستے سے اپنے سر کو بچایا۔ چھوٹی سی سٹڈی جو نمائشی نہیں بلکہ واقعی سٹڈی اور لائبریری تھی..... سامنے ایک رائٹنگ ٹیبل تھی جس پر ایک عدد لیمپ تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایل شیپ میں دو صوفے تھے اور اسی ایل شیپ میں دیوار میں شیلف پر کتابیں تھیں۔ سامنے کافی ٹیبل پر پھولوں سے بھرا گلدان تھا۔ میں نے بھی اپنے پھول اس میز پر رکھ دیئے۔ میں نے جلدی جلدی اپنے سویٹر پر سے پانی کے قطروں کو جھاڑا کہ کہیں میں بھیگی بلی نہ نظر آؤں۔ جب آپ کسی امیر شخص کے گھر جاتے ہیں تو آپ متاثر ہوتے ہیں اس کے صوفوں سے، اس کے پردوں سے، اس کی آرائش سے، اس کے چمکتے فرش سے، اس کے گھر کے بیرونی رنگوں سے اور افسوس کہ ان کے پاس اس کے علاوہ متاثر کرنے کیلئے کچھ نہیں ہوتا۔ کتنے تہی دامن ہوتے ہیں وہ لوگ۔ مگر آج..... کیا بات تھی میری نظر میں اس گھر کی۔ اس معمولی گھر کی، اس کی دیواروں کی، جہاں تارڑ صاحب جیسی شخصیت رہتی ہے۔ اس گھر کو کسی آرائش کی ضرورت نہیں۔ پردے صوفے، آرائش یہ سب تو گزرتے وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں مگر ایک حساس اور جاگتا ذہن ان تمام اوچھے ہتھیاروں سے مبرا اور لافانی ہے.....وہاں باوردی ملازم نہیں تھے.....ایک سادی سی لڑکی تھی.....اس لڑکی نے پوچھا آپ چائے پئیں گی؟ میں نے کہا ضرور۔ اس وقت اس سے اچھی چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ نوید بھی دی کہ صاحب ابھی آتے ہیں۔ اس وقت میں کچھ نروس ہو گئی کہ اگر تارڑ صاحب نے پوچھ لیا کہ مدعا کیا ہے؟ .....تو کیا جواب دوں گی.....سوائے ایک احمقوں جیسی شکل بنانے کے۔ خود سے بھی سوال کیا کہ بھئی ملنا کیا ضروری ہے۔ کتابیں پڑھنا کافی نہیں؟ لیکن عجیب بات ہوئی جب تارڑ صاحب ایک سادے سے قمیض شلوار اور سویٹر میں اندر داخل ہوئے تو ایسا لگا جیسے میں ہمیشہ سے انہیں جانتی ہوں۔ شاید کسی کی کتاب پڑھنا اس سے آدھی ملاقات کے برابر ہوتا ہے۔ نہ انہوں نے مدعا پوچھا نہ ہم نے احمقوں جیسی شکل بنائی۔ بات ان کی کتاب خس و خاشاک زمانے سے شروع ہوئی کہ یہ ان کی آخری کتاب ہے جو میں نے خریدی ہے۔ میں نے کہا آپ نے ساٹھ کتابیں لکھی ہیں ایک زندگی میں ایک شخص اتنی کتابیں کیسے لکھ سکتا ہے۔ کہنے لگے میں پچھلے ۴۵ سال سے لکھ رہا ہوں، کبھی کوئی نوکری نہیں کی۔ کیا ان کتابوں کی رائیلٹی سے آپ کا گزارا ہو جاتا ہے.....ہرگز نہیں میرا گزارا میڈیا سے ہوتا ہے۔ جب میں نے: شادی آن لائن: ٹی وی پروگرام کیا تو بہت سے لوگوں نے اعتراض کیا یہ پروگرام آپ کے شایان شان نہیں..... لیکن میں نے یہی جواب دیا کہ میرا کچن میڈیا ہی سے چلتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ باہر کے ملکوں میں لکھنے والے بہت کماتے ہیں تو یہ بھی صحیح نہیں۔ اس طرح تو

چند لوگ یہاں بھی کماتے ہیں مگر اس کے لئے آپ کو فیض یا فراز ہونا پڑتا ہے۔ نثر لکھنے والوں کو کہیں نہیں بلایا جاتا۔

مجھے یاد آیا کہ اسّی کی دہائی میں جب تارڑ صاحب مارننگ شو کرتے تھے تو اکثر بچے ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر ناشتہ کرتے تھے تاکہ ان کی دلچسپ باتیں سن سکیں۔ بڑے عرصے تک میں خود بھی منتظر رہی تھی کہ اس ڈبے میں کیا ہے جس کا وہ روز ذکر کرتے ہیں اور آج بھی یہ خواہش ہے کہ جان سکوں کہ اس ڈبے میں کیا تھا جس کے بارے میں وہ روز کہتے تھے کہ کل بتاؤں گا۔ مستنصر صاحب دیکھنے میں بھی اتنی ہی دلکش شخصیت کے مالک ہیں نرم لہجہ، ذہانت سے چمکتی ہمدرد آنکھیں، جملوں میں گاہے بگاہے ایک مزاح کا عنصر اور پھر فوراً ہی اس مزاح کے درمیان ایک فلسفیانہ سوچ کا شاخسانہ..... الاسکا کے سفرنامے کے آغاز میں انہوں نے اپنے تخیل سے ایک کونج تخلیق کی ہے لگتا ہے وہ کونج ہمیشہ سے ان کا حصہ رہی ہے جو اکثر ان کے اندر سے نکل کر ان پر تنقید کرتی رہتی ہے۔ تارڑ صاحب نے اس سفر میں اپنے اکلاپے کے لئے وہ کونج تخلیق کی بالکل اسی طرح جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے اکیلے پن سے اکتا کر انسان تخلیق کیا۔ جنت کے پرفیکٹ موسموں سے نکال کر اسے اس دنیا میں لا کھڑا کیا۔ جہاں اسے زمانے کے گرم و سرد جھیلنے پڑے..... یہ اور بات ہے کہ اب وہ آدم خود اپنے خالق کے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور کہتا ہے..... کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر..... الاسکا کے سفر میں نظاروں کے ساتھ ساتھ ان کی کونج بھی بہت مزہ دیتی ہے۔ بالکل ایک Nagging wife کی طرح ہے کہ اس کے بغیر رہا بھی نہیں جاتا اور وہ بھاتی بھی نہیں۔ ان کی کتاب: خس و خاشاک زمانے:..... میں ایک اپاہج لڑکی کا کردار ہے جو اپنی پوری زندگی ایک کمرے میں گزارتی ہے..... اس کی ماں جب اسے کہتی ہے کہ تو ہر وقت سہگل کے گانے سنتی رہتی ہے کبھی تو اللہ کا نام لیا کر اس کا شکر ادا کیا کر..... تو لڑکی جواب دیتی ہے کہ..... بے بے اللہ کا نام تو لے اسکا شکر تو ادا کر کہ اس نے تجھے سب کچھ دیا ہے..... میں کس بات کا شکر کروں..... کتنا کرب ہے اس جملے میں..... کیا مشاہدہ ہے اس لکھنے والے کا..... اور جو شخص بغیر کسی خوف کے یہ جملہ لکھ سکتا ہے یقیناً اس کرب سے گزرا ہے۔ بذات خود نہیں مگر اپنے کرداروں سے ہو کر۔ ان کی یہ کتاب ڈیوڈ کوپر فیلڈ کی طرح ہے کہ ایسے بہت سے کردار ہیں جو زندہ و جاوید ہو کر آپ کے سامنے کھڑے ہیں۔

یا زندہ و جاوید ہو جانے چاہئیں۔ مگر ہماری قوم بغیر کچھ کئے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشامد میں مصروف اور جنت کی تلاش میں ہے..... ایسی قوم کے بہت سے قیمتی صحیفے زمانے کی گرد میں دفن ہو جاتے ہیں..... مستنصر صاحب وہ لکھاری ہیں کہ برش اور رنگوں کی جگہ الفاظ سے وہ تصویر کشی کرتے ہیں کہ آپ خود کو اس منظر میں محسوس کرتے ہیں..... وہ تمام رنگ جو وہ ایک سرسوں کے کھیت یا ابھرتے سورج میں دکھانا چاہتے ہیں آپ کی روح کو سیراب کر دیتے ہیں، تحریر ان کی ہوتی ہے اور آپ کو لگتا ہے کہ..... میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ہی میرے دل میں ہے..... تارڑ صاحب کہتے ہیں کہ انہیں اپنی تمام کتابوں میں بہاؤ سب سے زیادہ پسند ہے..... ہو سکتا ہے..... مگر میری نظر میں ان کی ہر کتاب میں بین السطور بہت کچھ ہے اور راکھ اور: خس و خاشاک زمانے: تو ایک تاریخ کو اپنے اندر سمیٹے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ انسانی نفسیات کے کتنا نزدیک ہیں..... اس کے لئے ان کا ہر کردار اس کا گواہ ہے۔

بہرحال وہ چمکتی ہوئی آنکھیں اور متناسب خدوخال والا ایک حساس چہرہ میرے سامنے تھا اور میرے پاس سوالات کا جم غفیر تھا..... مگر خیر..... ہم اٹھنے لگے تو کہا میں آپ کو اپنی کوئی کتاب دیتا ہوں..... وہ جو کتاب بھی اٹھاتے میری پڑھی ہوئی تھی۔ کہنے لگے آخری کتاب آپ نے کون سی پڑھی ہے..... خس و خاشاک زمانے..... میں آپ کو اس سے اگلی کتاب دیتا ہوں ایک ایسی جگہ کی کتاب جہاں بہت کم لوگ جاتے ہیں..... الاسکا..... میں نے کہا میں وہاں جا چکی ہوں..... بہت حیران ہوئے..... میں یہاں پہلے پاکستانی سے ملا ہوں جو وہاں گیا ہو..... میں نے کہا۔ لیکن مجھے یہ کتاب پڑھنے میں بہت مزہ آئے گا کہ میں ایک مرتبہ پھر ان جگہوں سے گزروں گی..... قلم اٹھایا..... آپ کا نام ص سے ہے؟..... نہیں سین سے..... میرا نام لکھ کر مجھے دکھایا..... سبوہا..... صحیح ہے؟..... غلط ہے..... کہنے لگے پہلی مرتبہ کسی ایسے شخص سے مل رہا ہوں جس کا نام میری طرح مشکل ہے۔ پھر لکھا..... سبوہا..... یا سبوحہ۔

چلتے چلتے اچانک رکے، میز پر میرے لائے ہوئے پھولوں کو بڑی خوبصورتی سے acknowledge کیا، بغیر کسی پرتکلف جملے کے، بغیر کسی اوکھے طریقے کے..... کہنے لگے: میری اگلی کتاب میں ایک کردار ہوگا ایک خاتون کا جو گاڑی سے اتر کر بارش سے خود کو بچانے کے لئے گلدستے کو اپنے سر پر رکھے بڑی تیزی سے جا رہی ہوگی، وہ کردار آپ ہوں گی..... دیکھئے گلدستے پر ابھی تک پانی کے قطرے موجود ہیں..... کتنا اچھا تھا یہ طریقہ، اس گھسے پٹے اور کاروباری انداز کے شکریہ سے جدا، بالکل مختلف۔ ایک بالکل انوکھا شکریہ۔

سی وی بمقابلہ سی وی

ارم رباب

یونیورسٹی کا زمانہ بڑا البیلا اور سہانا ہوتا ہے۔ مچلتی جوانی اور اس کی بانہوں میں مہکتی بے فکری کچھ ایسا سماں باندھ دیتی ہے کہ ہر کوئی عالم بے خودی میں آدرش، خواب اور مقصد بھلا بیٹھتا ہے اور جوانی و بے فکری کی مدھر لَے پر رقصاں ہوتا ہے ایسے میں وقت کسی برق رو پنچھی کی طرح دور اُڑان بھر جاتا ہے لیکن میرے ساتھ کبھی ایسا نہ تھا بلکہ یوں سمجھ لیجیے کہ ذمہ داریوں کے انبار نے مجھے جوانی کے اس خمار سے بچائے رکھا۔ ہر دم پڑھنے کی لگن اور آگے بڑھنے کی دُھن میرے سر پر سوار رہتی۔ یونیورسٹی میں ہونے والی ہر طرح کی ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا اور آخر کیوں نہ لیتا ان کے بغیر میرا C.V دوسرے لوگوں سے کیونکر مختلف ہو سکتا تھا؟ دورانِ تعلیم میں یونیورسٹی کی رنگ برنگی دنیا سے الگ تھلگ ہی رہا۔ گو کہ یونیورسٹی کی ہر تقریب میں جوش و خروش سے حصہ لیتا لیکن میرا زاویہ نگاہ دوسروں سے مختلف تھا۔ میں ہر لمحہ موجود سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا تا کہ اُن کے توسط میں آنے والے لمحوں کو روشن کر سکوں۔ میرے اساتذہ مجھ سے خوش تھے، میرے ہم نوا مجھے چاہتے تھے۔ بس سب کو مجھ سے ایک شکوہ تھا کہ میں ان سنہرے دنوں سے لطف اندوز نہیں ہو رہا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ آنے والے دنوں میں جب ذمہ داریوں کا بوجھ مجھے تھکن سے چور کرے گا اور فکر کی پرچھائیاں چہرے کی مسکراہٹ چھین لیں گی تو شاید میری یادوں کی زنبیل میں کوئی بھی ایسی خوش کن یاد نہیں ہوگی جو ان تمام فکروں کو بھلا کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دے لیکن سب کی نصیحتیں میرے مزاج میں کوئی تبدیلی نہ لا سکیں۔ میرے اندر تو ایک ہی لگن تھی کہ میں پر لگا کر اُڑ جاؤں اور میرے پاؤں بس منزل پر جا کر ٹِک جائیں۔ ہاں میں نے آپ سے اپنے خواب اور آدرش کا تو ذکر ہی نہیں کیا۔ دراصل میرا ایک ہی سپنا تھا کہ میں اپنی ہی یونیورسٹی میں بطور لیکچرر جاب حاصل کر لوں۔ اسی لیے تو میں ہر لحاظ سے ایک پرفیکٹ C.V کے حصول کے لیے سنہری دور میں بھی سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر پھرتا تھا۔ میں نے اپنے ہر سمیسٹر میں سر توڑ محنت کی۔ چوتھے سمیسٹر میں تو میں نے دن رات ایک کر دیا اور اس طرح میں بہترین انٹرنی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ میں نے اپنے تھیسس (Thesis) پر بھی بہت زیادہ محنت کی۔ میں ہمیشہ Supervisor کی دی ہوئی ڈیڈ لائن سے پہلے کام لے کر جاتا۔ نتیجہ میری اُمیدوں کے عین مطابق تھا اور میں اپنے ڈیپارٹمنٹ میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ نتائج ملنے کے بعد جب ہم سب کلاس فیلوز اپنا C.V بنا رہے تھے تو بلاشبہ میرا C.V سب سے نمایاں اور منفرد تھا۔ اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ، تقاریر، مضمون نویسی، نظم خوانی اور مختلف اخبارات میں لکھنا۔ علاوہ ازیں بہت ساری ٹریننگز نے میرے C.V کو چار چاند لگا دیے تھے۔ سب نے میرے C.V کو سراہا اور مجھے دُعا دی کہ جلد ہی میرے سپنے سچ ہو جائیں گے۔ شاید میرے کلاس فیلوز کی انہی دُعاؤں کا اثر تھا کہ اگلے ہفتے ہی یونیورسٹی کی جانب سے لیکچرر کے لیے خالی نشستوں کا اعلان کر دیا گیا۔ میں تو پھولے نہ سما رہا تھا۔ اب میرے خواب حقیقت کی جانب بڑھ رہے تھے۔ میں نے بڑے اہتمام سے اپنے کاغذات تیار کیے اور دوستوں کے ہمراہ جمع کرانے رجسٹرار آفس پہنچا۔ میرے دوستوں نے مجھے قسمت کا دھنی قرار دیا۔ اب تو میں کھلی آنکھوں بھی روسٹرم پر کھڑے ہوئے لیکچرز ڈیلیور (Deliver) کرتا۔ رات کو سپنے سچ ہونے کی خوشی مجھے دم نہ لینے دیتی اور اس طرح سوتے ہوئے میں نہ تو سو سکتا اور نہ ہی جاگتے ہوئے جاگ سکتا۔ آخر وہ دن آ پہنچا جب مجھے انٹرویو کا کال لیٹر ملا۔ میں ذہنی طور پر سلیکشن بورڈ کے سامنے جانے کے لیے مکمل طور پر تیار تھا۔ میں اس دن بہت خوش تھا۔ مجھے اپنے اساتذہ اور ہم نواؤں کی دعاؤں اور تسلیوں پر مکمل بھروسہ تھا اور سب سے بڑھ کر مجھے اپنی جہد مسلسل پر ناز تھا۔ سلیکشن بورڈ کے سامنے جاتے ہوئے میں ذرا بھی نہ جھجکا اور میرا انٹرویو توقع سے زیادہ اچھا ہو گیا۔ انٹرویو کے بعد تو مجھے یوں لگا کہ میرے خواب عدم کی دہلیز پار کر کے حقیقت کا رُوپ دھار چکے ہیں۔ ایک ہفتے بعد میں ڈیپارٹمنٹ گیا تو مجھے پتہ چلا کہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرر کی تعیناتی کا حتمی فیصلہ ہو گیا ہے مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ میرا سلیکشن نہیں ہوا تھا۔ ہر کوئی انگشت بدنداں تھا۔ میرے چاہنے والے افسردہ تھے اور مخالفین حیرت زدہ۔ میرے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ نے مجھے تسلی دیتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ اگرچہ آپ اس پوسٹ کے لیے سب سے مناسب اُمیدوار تھے لیکن ہم V.C کے فیصلے کو چاہتے ہوئے بھی رد نہیں کر سکتے۔ ہاں V.C جیت گیا تھا اور C.V ہار گیا تھا۔ حالانکہ تہجی ترتیب کے مطابق C.V درست ہے اور V.C اُس کا اُلٹ اور شاید اسی اُلٹی ترتیب کی بدولت اس نے میرے قسمت کے ستارے ہی اُلٹ دیے تھے اور اب میں تہی داماں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ شاید میری یادوں کی زنبیل میں کوئی بھی ایسا خوش کن لمحہ موجود نہیں تھا جو آج میرے ہونٹوں کی تلخی کو مسکراہٹ میں بدل دے۔ C.V سے مراد کوائف نامہ جبکہ V.C سے مراد وائس چانسلر۔

زہریلا انسان

آغا گل

بہت دنوں سے جلات خان فراری بنا پھرتا تھا۔ کسی قوم قبیلہ والے کو تو اغوا کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ سب سے پہلے وہ بازار سے جیرانائی اُٹھا کے لے گیا۔ اس کے بعد پھتو قصائی پہ عتاب نازل ہوا۔ ازاں بعد اس نے بڑا ہاتھ مارا اور ژوب کے اسٹیشن ماسٹر نذیر کو اغوا کر کے پہاڑوں میں لے گیا۔ ایک زمانے سے ٹرین بند پڑی تھی۔ زمانہ بدلا مگر سو برس میں ٹرین کا شیڈول نہ بدلا گیا۔ حسب سابق وہ تیسرے روز کوئٹہ سے ژوب پہنچ پاتی۔ جبکہ کوچ پانچ گھنٹے میں ہی پہنچا دیا کرتے۔ اسٹین کے بینچ اور بتیاں، آگ بجھانے والے بالٹیاں اردگرد کے لوگ اپنے ہاں لے گئے تھے۔ یونہی بیکار پڑی تھیں۔ اچھا ہوا کسی مسلمان بھائی کے کام آئیں گے۔ سائیں سائیں کرتے اس ریلوے اسٹیشن پر ٹکے رہنے کا سبب نوکری کے علاوہ اکلوتا بیٹا فہیم بھی تھا جو اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہاں اچھی ڈویژن ملنے کے امکانات تھے۔

اس اغواء کی مقامی انتظامیہ کو خبر نہ ہوئی۔ ریلوے کا عملہ پہلی پہ تنخواہ لینے آیا تو اسے علم ہوا۔ سبھی اِدھر اُدھر اپنا کام دھندا کرتے مگر ماہ بہ ماہ تنخواہ کی وصولی کے لیے پہنچ جایا کرتے۔ انہوں نے ہڑتال کر دی۔ جو کارگر نہ ہوئی۔ کیونکہ ٹرین تو دس برس سے بند تھی۔ شہر میں جلوس نکالا دھرنا دیا تو گزشتہ ماہ کی تنخواہ انہیں دے دی گئی۔ جسے جیب میں ڈال مردہ باد کے نعرے لگاتے سبھی نے اپنی اپنی راہ لی۔ اس بار جلات نے کسی بڑے افسر پہ ہاتھ ڈالنے کا منصوبہ بنایا۔ اکثر افسر بااثر قبیلوں کے تھے۔ باقی چند ایک کے ساتھ لیویز اور پولیس کی نفری رہا کرتی۔ ان کے بنگلوں پہ بھی پہرے ہوا کرتے۔ ضلعی انتظامیہ نے جلات سے متعدد بار مطالبہ کیا کہ وہ اغوا شدگان کو رہا کر دے سارے مطالبے ماننا تو مشکل تھا۔ البتہ اسے لیویز کے دس سپاہیوں کی آسامیاں دی جائیں گی۔ بنک سے زرعی قرض دیا جائے گا جسے پھر معاف کر دیں گے۔ جلات یوں تو پولیٹکل ایجنٹ اور دیگر افسروں سے ملتا جلتا رہتا۔ ان کے بلاوے پر مسلح ساتھیوں سمیت چلا بھی آتا۔ مگر چائے پی کر ٹکا سا جواب دے واپس چل پڑتا۔ انتظامیہ بھی در پردہ خوش تھی کہ پٹرولنگ اور سیکورٹی کی مد میں نئی گاڑیاں اور زیادہ بجٹ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ لیویز کے لیے دس موٹر سائیکلیں بھی بس کی چھت پہ بندھی چلی آئیں۔ جو افسروں نے اپنے اردلیوں اور اسکول جانے والے بیٹوں کو دے دیں۔ حالانکہ یہ تو گشت بڑھانے کے لیے آئی تھیں۔

چونکہ جلات مادر زاد ان پڑھ تھا اُسے پوچھنا پڑتا تحقیق کرنی پڑتی کہ بڑا افسر کون ہوتا ہے۔ اس بار قرعہ فال ہیڈ ماسٹر کے نام نکلا۔ وہ بیس گریڈ کا افسر تھا۔ اس کے ماتحتوں اور شاگردوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ جلات خان نے اسے اسکول سے گھر جاتے اُٹھا لیا۔ کھینچ کھانچ کر گاڑی میں ٹھونسا اور اپنے مسکن کی راہ لی۔ سڑک سے ڈیوٹی پہ کھڑے سپاہی سٹک گئے۔ تحصیلدار اس کا دور کا عزیز تھا۔ اسے پہلے ہی مطلع کیا جا چکا تھا۔ واردات سے قبل ہی وہ نفری کے ہمراہ کالو قلعہ کی جانب مراجعت کر چکا تھا۔

ہیڈ ماسٹر رمضان نے غل غپاڑہ کیا۔ مدافعت بھی کی جو رائیگاں گئی۔ تنگ آ کر انہوں نے رمضان کا منہ باندھ دیا۔ آنکھوں پہ سیاہ پٹی باندھ دی اور کہیں جا کر اُن ویران بے آب و گیاہ پہاڑوں میں پٹی کھولی۔ رمضان پیاس سے مرا جاتا تھا۔ اس نے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ جلات نے تاکید کر دی کہ رمضان یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ پہاڑوں میں بھٹک جائے گا۔ بھوکا پیاسا مر جائے گا یا پھر پہاڑوں کے بھوکے بھیڑیوں کا نوالہ بن رہے گا۔ ان سے بھی بچ نکلا تو کوئی دوسرا قبیلہ اغوا کر کے چوکھا مال کمائے گا۔ رمضان کو درختوں میں گھری اسی کھولی میں بند کر دیا گیا۔ جہاں جیرانائی اور پھتو قصائی کے علاوہ اسٹیشن ماسٹر نذیر بھی آنسو بہا رہا تھا۔ جیرانائی اور پھتو قصائی تو دن بھر مصروف رہا کرتے۔ پھتو نے دنبے بکرے ذبح کرنے، گوشت کاٹنے اور کھال اُتارنے کے اسرار و رموز نوجوانوں کو سمجھائے۔ چھری وہ بس ہلکی سی لگاتا تو پٹھہ (Tendon) کٹنے کے سبب ران الگ ہو رہتی۔ پہاڑوں میں چند گھروں کی بکھری بکھری آبادیاں تھیں۔ اکثر انہیں پاس پڑوس لے جایا جاتا۔ جہاں پھتو اپنے فن کا مظاہرہ کرتا۔ جیرانائی کو استرے قینچیاں مہیا کر دی گئی تھیں۔ وہ بھی ساتھ ہو لیا اور نئی آبادی میں بال بناتا داڑھی مونڈھتا۔ باتوں ہی باتوں میں وہ راستہ دریافت کرنے کی کوشش کرتے مگر ناکامی رہتی۔ جیرا کم عمر تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کو یاد کر کر کے رویا کرتا۔ اپنی منگیتر کو یاد کر کے بھی آہیں بھرا کرتا۔ اسے خدشہ تھا کہ طویل گمشدگی کے باعث کہیں منگنی ہی نہ

ٹوٹ جائے۔ پھتو پچپن برس کا تھا۔ وہ جیرا کو تسلی دیا کرتا۔ حالانکہ وہ خود بھی بیوی بچوں کے لیے پریشان رہتا۔ اسٹیشن ماسٹر نذیر کو ڈھور ڈنگر کا انچارج بنایا گیا تھا۔

جلات خان نے سوچا کہ جو افسر ریلوے اسٹیشن سنبھال سکتا ہے وہ بار برادری کے گدھے، دنبے اور بکرے بخوبی سنبھال سکتا ہے۔ نذیر خون کے اشک پیتا گدھے لے کر قریبی پہاڑوں میں جاتا۔ وہاں خشک لکڑیاں جمع کرتا انہیں گدھوں پہ لادتا اور ہنکاتا ہوا جیل خانے کی راہ لیتا۔ گدھے مردوں پر اپنی جسمانی برتری کے باعث کبھی مردوں کے پیچھے نہیں چلتے۔ بلکہ انہیں ہی پیچھے پیچھے چلاتے ہیں۔ نذیر بھی انہیں ہانکتا چھڑیوں سے نوازتا واپس لوٹتا تو ڈھیر ہو جاتا۔ دس برس اس نے بچے پیدا کیے تھے۔ تنخواہیں بانٹی تھیں اور کوئی کام نہ کیا تھا۔ ان بدمست باغی گدھوں کے ہاتھوں وہ بوکھلا سا گیا تھا۔ حتیٰ کہ ایک بار وہ جلات خان کے سامنے سینہ تان کے کھڑا ہو گیا۔ ''میں اسٹیشن ماسٹر ہوں۔ مجھے اس طرح بے عزت کیوں کرتے ہو۔ اس سے تو بہتر ہے کہ گولی مار دو۔''

جلات اس نافرمانی پہ تمتما اُٹھا۔ اس نے پہلو میں پڑی کلاشنکوف اُٹھائی کاک کر کے نذیر پہ چھتائی تو نذیر کے اوسان خطا ہو گئے اور سر جھکائے گدھوں کو ہانکتا ان ویران پہاڑوں میں چلا گیا۔ جلات سمجھ نہ پایا کہ رمضان کو کون سا کام دیا جائے۔ وہ مفت کی روٹیاں توڑتا رہے۔ یہ بھی قبول نہ تھا۔ اس نے اپنے لڑکوں اور بھتیجوں کو تعلیم دینے پر معمور کر دیا۔ نذیر کے سینے پہ سانپ لوٹ گئے۔ کاش وہ بھی ٹیچر ہوتا خرکاری تو نہ کرنا پڑتی۔

رمضان نے ایک چٹان پہ تختہ سیاہ بنوالیا۔ دری کتابیں تو نہ تھیں وہ الف بے اور اے بی سی پڑھانے لگا۔ لڑکے مٹی پہ اس کے بولے گئے حروف تہجی لکھتے۔ وہ ان چار قطاروں میں بیٹھے بچوں، لڑکوں، نوجوانوں کو گھوم پھر کر درس دیتا ایک ماہر معلم ہونے کے سبب وہ ان کی توجہ بھی برقرار رکھتا۔ ان کے لکھے حروف درست کرتا۔ مٹی سے لفظ مٹا کر درست کر دیتا۔ قلم کی بجائے طلباء شہادت کی اُنگلی سے کام لیتے۔ رمضان کا خیال تھا ذرا لکھنا سیکھ لیں تو قلم تھمایا جائے۔ فی الوقت تو کلہاڑا چلانے کے انداز میں حرف لکھتے ہوئے بلاضرورت ہی طاقت استعمال کرتے۔ بعض دانتوں تلے زبان رکھ کر انہماک سے لکھتے تو رمضان کوفت محسوس کرتا۔ نہایت ہی غبی طلباء تھے۔ ان کا سیکھنے کا عمل نہایت ہی سست بلکہ مایوس کن تھا۔ وہ C اور G میں فرق محسوس نہ کرتے تو رمضان حکمت عملی اختیار کرتا۔ ''دیکھو بھئی میں C ہوں میرا پیٹ خالی ہے۔ جلات G ہے۔ ذرا غور سے دیکھو اس کا پیٹ بھرا ہوا ہے۔''

رمضان کے اغوا پہ ایک روز ہڑتال رہی۔ طلباء نے جلوس بھی نکالا۔ حکومت کے خلاف نعرے بھی لگائے جو حکومت تک نہ پہنچ سکے جو وہاں سے پانچ گھنٹے کی مسافت پہ تھی۔ سیکنڈ ہیڈ ماسٹر نے اساتذہ یونین کی مدد سے اپنے لیے ہیڈ ماسٹر بننے کے احکامات حاصل کر لیے۔ رمضان تو غیر مقامی تھا۔ اسے کیا حق حاصل تھا کہ افسری کرتا پھرے۔ چند ہی روز میں سبھی لوگ رمضان کو بھول بیٹھے لیکن انتظامیہ بازیابی کے لیے ڈرامہ کرتی رہی۔ اضافی بجٹ بھی ملا اور سیکورٹی کی مد میں خاصی رقم بھی حاصل کر لی۔ پٹرولنگ اور گاڑی کی مرمت و دیکھ بھال کے لیے ملنے والی رقم سے اپنے حالات درست کیے۔ اپنے بنگلوں پہ سپاہیوں کی تعداد بھی بڑھالی۔ یوں بھی ساری پولیس ججوں، افسروں، وزیر وزراء کے پروٹوکول پہ لگی تھی۔ انہیں شہریوں کا فون چوسنے کے سوا ان سے کوئی رغبت نہ تھی۔ یوں تو رمضان کے اغواء پر ہڑتال ہو گئی۔ طلباء نے جلوس بھی نکالا۔ افسروں نے وعدے بھی کیے کہ جلد ہی برآمدگی ہو گی۔ اغواء سے افسروں کو فائدہ ہوتا سیکورٹی بجٹ بڑھ جاتا، نئی آسامیاں ملتیں چند روز اس شہر میں گہما گہمی رہتی۔ جیسے تیجے پہ خیرات بٹتی ہے۔ قرآن خوانی ہوتی اور لوگ پھر دوبارہ روزمرہ کے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ لوگ اغواء ہونے والوں کو فراموش ہی کر بیٹھتے۔

نذیر کو بخار نے آلیا۔ وہ یوں بھی دکھی اور نراش رہا کرتا تھا۔ پورے علاقے کو علم تھا کہ تینوں اغوا شدہ ہیں۔ ان سے علیک سلیک بھی ہوتی اور بعض اوقات ان کی بے بسی کا مذاق بھی اُڑایا جاتا۔ خشک ایندھن لانے کے لیے جیرا کو کہا گیا۔ اس کے ساتھ ایک بندوق بردار جایا کرتا۔ مگر وہ بہت مطمئن سا لاتعلق سا رہتا۔ جیرا نے محسوس کیا کہ بندوق بردار اسے بھی دو ٹانگوں والا گدھا سمجھتا ہے۔ جو بھاگ نہیں سکتا۔ فرار نہیں ہو سکتا۔ بندوق بردار قیوم مزے سے نسوار ہونٹوں میں داب تسبیح پھیرتا رہتا۔ بندوق کو لاٹھی کی مانند ساتھ لیے پھرتا۔ دوپہر میں خشوع و خضوع سے نماز ادا کرتا۔ ایسے میں اپنے جوتوں کے ساتھ بندوق بھی سامنے رکھ لیتا۔ مسجد میں جوتے سامنے رکھ کر نماز ادا کرنے کی ایسی عادت پڑی تھی کہ ویران پہاڑ میں بھی یہی وطیرہ اختیار کرتا۔ حالانکہ جوتا چور مساجد میں ہوتے ہیں پہاڑوں میں نہیں۔ خود نماز ادا کرنے کے بعد قیوم اجازت دیتا تو جیرا نماز پڑھتا۔ نماز عصر کے بعد وہ دونوں

واپس چلے آتے۔ گاؤں والے سرِ شام کھانا کھا کے سو رہتے۔ وہ تینوں بھی جلات کو کوستے سو جاتے۔

جیرا بلند حوصلہ انسان تھا۔ کسی بندر یلوے اسٹیشن کا مجہول اسٹیشن ماسٹر نہ تھا۔ استرے سے مسلمانی کرنے والا بڑے بڑے جغادریوں کا سر اپنے حضور جھکا دینے والا، ٹنڈ کر دینے والا جوان تھا۔ اس نے فرار کا سوچا۔ وہ قیوم کا مزاج بھانپ چکا تھا۔ اب جیرا روزانہ ایک روٹی بچا لیا کرتا۔ چار روز بعد اس نے پہاڑ میں موقعہ پاتے ہی قیوم کو قابو کر لیا۔ پالان کی رسی سے قیوم کی مشکیں کس دیں۔ پاؤں باندھ دیے۔ اسے منہ کالا کیے بغیر ہی گدھے پر سوار کرا دیا۔ دوسرے پہ خود شہسوار کی مانند بیٹھ کر بندوق تانی اور حکم دیا پتر راستہ بتا۔ ورنہ تیرے بھیجے میں سوراخ کر دوں گا۔ قیوم جانتا تھا کہ بندوق بھی پولیس کی طرح اسی کی ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں ہو۔ وہ بے چوں چراں پگڈنڈیوں سے مین روڈ کی جانب راستہ بتلاتا رہا۔ اتنے میں اندھیرے نے آ لیا۔ جیرا نہایت ہمدردی اور دل سوزی سے قیوم کے منہ میں روٹی دے دیا کرتا۔ پانی کی چھاگل بھی لگا دیتا۔ اگلی شام سڑک دکھائی دی تو گدھا دوڑاتا کہیں کا کہیں نکل گیا۔ پہلے ہی چینکی ہوٹل پہ اس نے گدھا اور بندوق اونے پونے فروخت کر ڈالی۔ ہوٹل والا بھی خوش ہوا اس کی تو لاٹری نکل آئی تھی۔ اس نے کہہ سن کر مال بردار ٹرک پہ سوار بھی کروا دیا۔ جیرا مصمم ارادہ کیے بیٹھا تھا کہ واپس نہیں لوٹے گا۔ بلکہ اپنے آبائی علاقے میں نکل جائے گا۔ جانے پہلے گنجے انسان پیدا ہوا کرتے تھے ورنہ اس کا دادا ان بے رحم پہاڑوں میں کیوں چلا آیا۔ جہاں دھوپ سے بچنے یا بارش میں چھپنے کے لیے غاریں تک نہیں۔ ایسے نامہرباں پہاڑوں کے باسیوں کے دلوں میں رحم اور مروت کے ٹاپو اور گھپائیں بھلا کہاں۔ ورنہ کوئی تو اسے چھڑوا دیتا۔ اُلٹا اسی کی بے بسی کا مذاق اُڑایا کرتے۔

اُدھر جلات نے رات تو کانٹوں پہ گزاری اور اگلی صبح اپنا لشکر لے کر جیرا کی تلاش میں نکلا۔ چونکہ دشوار گزار پگڈنڈیوں سے گزرنا تھا ان کی رفتار ان کے جذبات سے کہیں کم رہی۔ انہیں اِدھر اُدھر چرتے ہوئے گدھے بھی مل ہی گئے۔ مگر سنگلاخ چٹانوں کے باعث کھوجی بھی جیرا کے کھرے نہ اُٹھا سکا۔ قیوم بھی مہجوب سا خود ہی چلا آیا۔

جلات کی علاقہ بھر میں بڑی سبکی ہوئی۔ اپنی عزت بچانے کے لیے اس نے اعلان کر دیا کہ اگر اس کے مطالبے نہ مانے گئے تو وہ اغوا شدگان کے گلے کاٹ ڈالے گا۔ پھتو قصائی اور نذیر تو اس خبر سے بے جان ہو گئے۔ ان کے پاؤں سن ہو گئے۔ حالانکہ پھتو نے عمر بھر گلے ہی کاٹے تھے۔ کلمہ پڑھ کر وہ چھری چلاتا اور تڑپتا بکرا یا بکری ایک جانب دھکیل کے نئے جانور کی گردن پکڑ لیتا۔ مگر اس خبر پہ وہ کانپنے لگا۔ بلکہ رمضان نے حوصلہ مندی سے یہ اعلان سنا اور اس کے مطالبے نے جلات کو دہلا کے رکھ دیا۔

''جلات خان! جب چاہو قتل کر ڈالو۔ موت تو برحق ہے۔ ژوب کے ہسپتال میں دوائیاں نہیں، آکسیجن سیلنڈر خالی پڑے ہیں۔ ڈاکٹر اعلیٰ تعلیم کے لیے غائب رہتے ہیں یا پھر کوئٹہ یا کراچی میں کلینک چلاتے ہیں۔ ہسپتال میں تڑپ تڑپ کر مرنا یا پھتو قصائی کی چھری کے نیچے جان دینا کیا فرق ہے۔ مگر مجھے تعلیم سے مت روکنا۔ بلکہ کلاس ختم کر لوں تب ذبح کرنا وہ بھی طلبہ سے چھپا کے ورنہ ان کے ذہنوں پہ برا اثر پڑے گا۔''

ژوب انتظامیہ نے جانچا کہ اغوا شدگان کے سری پائے ملے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ جلات کے بہت سے مطالبات مان لیے۔ سیکریٹ فنڈ سے معقول رقم بھی دے ڈالی۔ اپنے ہی چار سپاہیوں کے سروں پہ چادریں ڈال کر ہتھکڑیاں لگا کر پریس کے سامنے پیش کیا کہ ان مشکوک افراد سے معلومات حاصل کر کے اغوا شدگان تک پہنچا جائے گا۔ ملزمان کو کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لیں گے۔ جلات کے اب دو مطالبات رہ گئے۔

اوّل ان کے گاؤں تک بجلی پہنچائی جائے۔ دوئم گاؤں کے اوپر پہاڑ میں ڈیم بنایا جائے۔ تاکہ بارشوں کا پانی جمع کر کے کاشتکاری کی جا سکے۔ ڈھور ڈنگر پانی لانے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ اس کی بجائے گاؤں کے پہلو میں ڈیم سے یہ سہولت حاصل ہو سکے گی۔ حکام نے وعدے وعید کیے جس کے باعث جلات بھی قدرے مدھم ہو گیا اور اس نے بھی تیز چھریاں ایک جانب رکھ دیں جن کی نمائش اس کا معمول تھا۔ ذبح ہونے کا خوف دور ہونے کے باعث تینوں مغوی بہتر محسوس کرنے لگے۔ نذیر اور پھتو کو گاؤں سے باہر نہ نکلنے دیا جاتا۔ وہیں انہیں مختلف قسم کے کام دیے جاتے۔ جنہیں وہ نہایت ہی خوش اسلوبی سے انجام دیا کرتے اور جلات کے سامنے آنے سے بچتے کہ کیا عجب جلال اکبری کا نشانہ بننا پڑے۔

رمضان کی تعلیم کے باعث نوجوانوں اور بچوں کا ذہن بدلنے لگا تھا۔ اس نے بتلایا کہ ان کے باپ

دادا سے صدیوں پہلے ایک مسلمان مفکر ابن خلدون نے واضح کیا تھا کہ جو بھی جاندار جس ماحول میں رہے ویسا ہی بن جاتا ہے۔ صحراؤں کے سانپ خاکی، جنگلوں کے سبز اور برفانی علاقوں کے سفید ہوتے ہیں۔ اسے ماحولیاتی اثر کہا جاتا ہے۔ رمضان نے Ecological Effect نہ کہا۔ وہ آسان عام فہم زبان میں تعلیم دینے کا ماہر تھا۔ اصطلاحات سے بھی پہلوتہی کرتا۔ تاکہ طلباء کے ذہن پہ زور نہ پڑے۔

''اچھا..... ہم تو بھیڑ بکریوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی عادت کیسی ہے۔ ان کا ماحول کیسا ہے؟'' طلباء نے دریافت کیا۔

رمضان بولتا چلا گیا: ''بھیڑ بکریاں کم عقل اور بزدل ہوا کرتی ہیں۔ ایک بھیڑ چوراہ اختیار کرے سبھی اس پہ دوڑ پڑتی ہیں۔ اندھی تقلید کرتی ہیں جس کے باعث بھیڑ چال محاورہ بنا۔ ان کی زندگی کا محور ہے چارہ کھانا پانی پینا اور بچے پیدا کرنا۔ بزدلی، ڈر ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔''

ہمارے ہاں کوئی بڑی چراگاہ بھی تو نہیں ہے۔ بڑے کھیت کھلیان بھی نہیں، خشک بنجر پہاڑ ہیں چارہ کم کم ہے۔ پانی بھی نایاب ہے۔ وادیوں میں رہنے والے ڈرتے ہیں کہ ان کے پانی اور چارے پر کوئی غیر قبضہ نہ کرے۔ اپنی اپنی وادیوں میں ڈرے ڈرے رہتے ہیں۔ غیر مقامی افراد سے خوف کھاتے ہیں۔ کیچ کے علاقے میں تو نفرت سے غیر مقامی کو ڈنی مردم کہتے ہیں۔ ان سے ہراساں ہوتے ہیں، گھبراتے ہیں۔ دور رہتے ہیں کسی کو اپنے میں شامل نہیں ہونے دیتے۔''

طلباء گھروں میں بھی یہی باتیں کرتے۔ جلات سے چھوٹے بیٹے نے دسترخوان پہ سوال کر ڈالا ''بابا! تم ڈرتے ہو جو بندوق اُٹھائے پھرتے ہو۔'' وہ اپنی چاروں بیویوں اور انیس بیٹوں کے ہمراہ شام کا کھانا کھا رہا تھا۔ ہر رنگ، ہر سائز ہر گڑا کے بیٹے موجود تھے۔ ''میں اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ نالائق'' اس نے چھوٹی بیوی کے لاڈلے بیٹے کو پیار سے ڈانٹا۔

''کون یہ باتیں کہتا ہے؟''

بیٹے نے سادگی میں بھیڑوں کی فطرت کی کہانی سنا ڈالی۔ مگر گھر گھر باتیں ہونے لگی تھیں۔ رمضان کا ایسا محبت بھرا انداز تھا کہ یوں لگتا پڑھا نہیں رہا گپ شپ کر رہا ہے۔

درختوں تلے اس کا اسکول لگتا تو وہ دلچسپی برقرار رکھتا۔ ''اچھا سوچو! کل مجھے بتانا وہ کون سا جانور ہے جو سو بھی جائے تو آنکھیں کھلی رکھتا ہے۔''

سبھی نے بہتیرا زور مارا۔ مگر رات گئے تک جواب نہ مل پایا۔ ان کے بزرگ بھی حیران رہ گئے۔ رمضان نے اگلے روز اعلان کیا کہ وہ جانور مچھلی ہے اور تعلیم دینے لگا۔ وہ پڑوسیوں کے حقوق، بچوں کے حقوق، سخاوت اور معاف کر دینے کے جذبے اُبھارتا۔ اس نے بتایا کہ نبیؐ مبارک نے اپنے پیارے چچا کی قاتلہ ہندہ اور قاتل وحشی کو بھی معاف فرما دیا تھا۔ جو ہمارے لیے باعث تقلید ہے۔ صلہ رحمی پہ بولتا اور عفو درگزر کی باتیں بتلاتا۔

جلات کی لاڈلی بیوی نے ایک روز انارکلی کے انداز میں تیور بدل کر کہا کہ وہ بچوں کے لیے شہر سے ٹافیاں اور کھلونے کیوں نہیں لاتا۔ اس کے لیے ریشمی کپڑے لانے کا خیال نہیں آتا کیا۔ دن بھر جو پتھروں پہ گولیاں چلا کر نشانہ بازی کرتا ہے اس رقم سے بچیوں کے لیے نئی چادریں بھی تو خرید سکتا ہے۔ اُبھرتے چبھتے سوالوں نے جلات کو ہلکان کر ڈالا۔ وہ مجروح ہو جاتا۔ دل میں جیسے چھید پڑ جاتے۔ ماحول اذیت ناک ہو چکا تھا۔ ایک روز جو ڈوب جانے کے لیے گاڑی میں آ بیٹھا تو اس کے جوان بیٹوں نے گھیر لیا۔ سوالوں کے تیر اس کے دل میں اترتے چلے گئے۔

''بابا! تم شہر جاتے ہو ہمیں کیوں نہیں لے جاتے؟''

''ہمیں ان بھیڑ بکریوں کے پاس چھوڑ جاتے ہو کیا ہم بھی ریوڑ کی طرح رہیں؟''

''اپنے ٹھاٹھ باٹھ دیکھو اور ہمارا لباس دیکھو۔ ہم بھی کیا دنبے بکرے ہیں؟ تمہارے مویشی ہیں۔ ہم سے ایسا سلوک کیوں کرتے ہیں۔ ہمیں کسی اسکول میں کیوں نہیں پڑھاتے کالج میں داخل کیوں نہیں کرتے۔''

جلات خان سکتے میں آ گیا۔ یہ ایک دبی ہوئی بغاوت تھی ایک چنگاری تھی جو سب کچھ بھسم کر سکتی تھی۔ اس شام وہ لشکر سمیت واپس لوٹا تو بجھا بجھا سا تھا۔ کھانا کھا کر گفتگو کیے بغیر آنکھیں موند کر لیٹ رہا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ مارے خوف کے بیویاں بھی اِدھر اُدھر ہو گئیں۔ جیرا کے فرار کے بعد مغویوں کے کمرے کو نماز مغرب کے بعد تالا لگا دیا جاتا۔ مغوی ان کے ساتھ نماز مغرب ادا کرنے کے بعد ہی بند ہوتے۔ مسجد میں اغوا کار خدا سے دعا کرتے کہ مغویوں کے بدلے کچھ مل جائے۔ جبکہ مغوی دعا کرتے کہ ان ظالموں سے چھٹکارا پائیں۔ مغرب کی نماز کے ساتھ ہی تینوں کو کھانا دے کر دروازے کو تالا لگا دیا جاتا۔ ایک شخص دروازے پہ پہرہ دیتا کہ کہیں نقب لگا کے نہ نکل جائیں۔

رات کے پچھلے پہر قدموں کی چاپ آئی۔ بندوقوں کی کھٹ پٹ ہوئی اور تالا کھلا تو متوحش ہو کر

پھتو چلایا ''سنبھلنا ہمارے قاتل آ گئے ہیں'' دونوں ہڑبڑا کر اُٹھے۔ لالٹین کی روشنی میں جلات کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ چہرہ لال بھبھوکا ہورہا تھا اور تو کوئی ہتھیار نہ ملا پھتو اور نذیر نے تکیے نکالے اور گرز لنڈھور کی مانند تان لیے۔

''خبردار! آگے مت آنا ورنہ تکیے مار مار کر مار ڈالوں گا۔'' پھتو غرایا۔ رمضان اس غیر متوقع شب صورت حال سے گھبرا کے جوتوں کی جانب لپکا۔ دونوں ہاتھوں میں جوتے خنجر بنالیے۔ پھتو کے ہوش بجا تھے۔ اس نے نعرہ بلند کیا ''ہیڈ ماسٹر صاحب! میرے بوٹ دس نمبر کے ہیں نیچے لوہے کے نعل لگے ہیں۔ وہ اُٹھالیں پاپڑ بنادیں سالوں کا۔'' رمضان نے جلدی سے اپنے جوتے پھینک پھتو کے بوٹوں سے مسلح ہوگیا۔ مگر حملہ آوروں نے ان کی ٹنڈیاں کس دیں۔ انہیں یکے بعد دیگرے پک اپ میں ٹھونس دیا۔ مغویوں کی آہ و بکا سے جلات کے اہل خانہ جاگ اُٹھے۔ اس کے جواں بیٹے آنکھیں ملتے باہر نکلے۔ انہوں نے جواپنے استاد کے درگت بنتے دیکھی تو مدد کے لیے لپکے۔ یہ دیکھ مسلح افراد گاڑی میں کود گئے اور گاڑی دوڑائی۔ رمضان نے دیکھا کہ جلات کے بیٹے انہیں بچانے کے لیے نعرے بلند کرتے گاڑی کے پیچھے پیچھے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ تو فرط جذبات سے اس کے اشک جاری ہوگئے۔ ناہموار راستوں پہ ہچکولے کھاتی گاڑی بہت دور نکل گئی۔ ایک چشمے کے پاس سے گزرے تو رمضان نے فریاد کیا۔'' ظالم! ہمیں آخری بار دو نفل تو ادا کر لینے دے۔'' جلات نے سنی ان سنی کر دی۔ رمضان کو اشک بار دیکھ کر ان کا ضبط بھی جاتا رہا۔ وہ دونوں بھی رونے لگے۔

پھتو مایوسی سے بولا ''ان سے کیا مانگنا یہ تو ظالم قصائی ہیں'' جلات جو چپ بیٹھا تھا بھڑک اُٹھا ''میں نہیں تم قصائی ولد قصائی ہو۔ بولو'' بندوق کی سرد نالی گردن پہ چبھی تو پھتو کو اقرار کرتے ہی بن پڑی۔ ''ہاں۔ قصائی تو ہوں اغوا کار نہیں ہوں۔'' ایک ایک لمحہ بھاری تھا انہیں یوں لگتا تھا ہزاروں برس گزر چکے ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ نذیر کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ ان کی آنکھیں بے جان ہو چکی تھیں۔

صبح کاذب پہ گاڑی تھم گئی۔ انہیں گاڑی سے گھسیٹ گھسیٹ کر اُتارا اور ایک ساتھ کھڑا کر دیا۔ نذیر لڑکھڑا کر گرا پڑا۔ اسے دوبارہ کھڑا کر کے دو آدمیوں نے تھامے رکھا۔ ''کلمہ پڑھو، کلمہ پڑھو'' رمضان نے توجہ دلائی۔ مگر جلات نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔ ''خاموش رہو'' ''ابو جہل نہ بنو ہم ضرور کلمہ پڑھیں گے۔'' جلات جھلا گیا ''چپ رہو! میری بات سنو! تم میرے قبیلے میں علم کا زہر پھیلا رہے تھے۔ تعلیم سے میرے بیٹوں کو بھی نہ بخشا۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ پھر ہمارے علاقے کا رُخ نہ کرنا۔ زہریلا آدمی!''

بک ہوم کی شاہکار کتابیں

مثالی ریاست	ارسطو/امجد محمود -/1200	پاکستان کی سیر گاہیں	شیخ نوید اسلم -/1000
کمہر ہونے تک (آپ بیتی) ہیلم ایکس/عمران الحق چوہان	-/1000	تاریخ ہند	ای۔مارسڈن -/800
سفر نامہ امریکہ	میکسم گورکی/خورشید جاوید -/400	داس کیپٹل	کارل مارکس/سید محمد تقی -/1000
وادیٔ سندھ اور تہذیبیں	سر مورٹیمر وھیلر/زبیر رضوی -/500	خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز	فریڈرک اینگلز -/600
پنجاب اور بیرونی حملہ آور	پروفیسر عزیز الدین احمد -/600	معاہدۂ عمرانی	ژاں ژاک روسو/ڈاکٹر محمود حسین -/400
سقراط (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق -/300	بڑی سوچ بڑی کامیابی	ڈاکٹر ڈیوڈ جوزف شیوارڈز -/600
افلاطون (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق -/400	جیسے خیالات ویسی زندگی	برائن ٹریسی/ملک اشفاق -/600
ارسطو (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق -/400	مسلم فلسفے کا تاریخی ارتقاء	ظفر سپل -/400
بقراط (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق -/300	ورثۂ دانش یونان	ظفر سپل -/300
ابن خلدون (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق -/600	تصحیح اللغات	زاہد مسعود -/400
ابن رشد (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق -/400	تنقیدی نظریات	کرامت بخاری -/500
ابن سینا (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق -/600	پاگل خانہ (افسانے)	نیر اقبال علوی -/600
ایڈیسن (عظیم موجد کی داستان زندگی)	جی گلینوڈ کلارک -/400	قلعہ (ناول)	فرانز کافکا/طارق عزیز سندھو -/700
آئن سٹائن (داستان زندگی)	سید شہاب الدین دسنوی -/400	چڑیوں کی الف لیلہ	کرشن چندر -/500
سوشلسٹ روایت موسیٰ سے لینن تک	الیگزینڈر گرے -/1800	کانڈید	والٹیئر/سید سجاد ظہیر -/500
مسلم لیگ اور تحریک پاکستان	پروفیسر ڈاکٹر ایم اے صوفی -/1600	فاؤسٹ	گوئٹے/ڈاکٹر سید عابد حسین -/600
پاکستان کے آثار قدیمہ	شیخ نوید اسلم -/1200	ماورائے خیر و شر	فریڈرک نطشے -/800
		اساس (Roots) (ناول)	ایلکس ہیلی

بک ہوم

بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور پاکستان

فون: 042-37231518-37245072

bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com

www.bookhomepublishers.com

www.facebook/bookhomelahore

نستعلیق مطبوعات کی کتابیں بک ہوم سے دستیاب ہے

شاعری

جنوں سے دل لگی اچھی بھلی ہے
ہماری عاشقی اچھی بھلی ہے
ہمیں سنتے نہیں تم کان دھر کر
سنو تو شاعری اچھی بھلی ہے
اسی میں خوب گزرے گی ہماری
محبت نوکری اچھی بھلی ہے
مجھے مکی کی روٹی راس آئے
یہی کافی، یہی اچھی بھلی ہے
نہیں ہے دوستی اخلاص والی
تمہاری دشمنی اچھی بھلی ہے
کھلے تو پھول سی مرجھا ہی جائے
کلی کی بے کلی اچھی بھلی ہے
مروں تو موت زندہ باد ثاقب
جیوں تو زندگی اچھی بھلی ہے

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

خرد محدود ہو کر پاگلوں میں
دھواں دینے لگی ہے مشعلوں میں
مجھے شہروں سے اندازہ ہوا ہے
درندے اب نہیں ہیں جنگلوں میں
غموں کی شام ٹھہری رات بن کر
خوشی کی صبح بیتی ہے پلوں میں
تجلی کو مقید کرنے والو!
چھپی ہیں بجلیاں بھی بادلوں میں؟
نئے مجرم ہیں تعزیریں نئی ہیں
مگر قاتل وہی ہیں مقتلوں میں
مرے شعروں میں ڈھلتے جا رہے ہیں
چھپیں گے وہ کہاں تک آنچلوں میں
نکلنے کے بہت امکان کم ہیں
پھنسے ہیں اب کے ایسی دلدلوں میں
سخنور جاہلوں میں جی رہے ہیں
کھلے ہیں پھول نصرت جنگلوں میں

نصرت صدیقی/فیصل آباد

سوائے اپنے کسی سے کوئی عناد نہیں
کسی کو ہے بھی اگر تو یہ مجھ کو یاد نہیں
میں اس سے پہلے کی ہرگز قسم نہیں کھاتا
یہ دل کسی پہ بھی آیا تمہارے بعد نہیں
لکیریں ہاتھ کی قسمت سے خار کھاتی ہیں
اسی لیے ہمیں قسمت پہ اعتماد نہیں
نظر کے سامنے ہر سو لہو اُبلتا ہے
اسی لیے ہمیں پانی کا رنگ یاد نہیں
ہماری اپنی جڑوں میں فساد پھیلا ہے
خدا کا خلق خدا سے کوئی فساد نہیں
غلط کہا ہے کسی نے انا پرست ہیں ہم
ہمارا عشق و محبت پہ اعتقاد نہیں
لڑائی ساری کی ساری یہاں مفاد کی ہے
فساد ہے یہ سراسر کوئی جہاد نہیں

مسعود احمد/اوکاڑہ

مجھ کو بے جان کر دیا تو نے
کتنا احسان کر دیا تو نے
کتنا حیران رہ گیا تھا میں
کتنا حیران کر دیا تو نے
اب تو میں بھی خدا کا قائل ہوں
یہ مری جان کر دیا تو نے
وہ مری زندگی کا حاصل ہے
درد جو دان کر دیا تو نے
میں عبث چارہ گر کو ڈھونڈتا تھا
درد درمان کر دیا تو نے
شکر صد شکر اپنی چوکھٹ کا
مجھ کو دربان کر دیا تو نے
جو نہ ریکھاؤں میں لکھا تھا جلیل
اس کا فرمان کر دیا تو نے

احمد جلیل/اوکاڑہ

اس لیے آپ سے پرے ہوئے ہیں
عشق سے ہم بہت ڈرے ہوئے ہیں
دل کی سننے سے پیش تر صاحب
آنکھ سے خوب مشورے ہوئے ہیں
تتلیاں کیوں نہ ہوں تعاقب میں
تیری خوشبو سے ہم بھرے ہوئے ہیں
تیرے ملنے سے یہ کمال ہوا
زرد لمحات بھی ہرے ہوئے ہیں

اپنی آنکھوں کا سوچنے والے
کیا مرے خواب سب مرے ہوئے ہیں؟
تیرے جیسے ہزار لوگوں نے
دل مرے پاؤں میں دھرے ہوئے ہیں
میری قامت پہ چند بونوں میں
ن رہا ہوں کہ تبصرے ہوئے ہیں
س کو شہباز بے سبب پرکھا
کھوٹے سکے کہاں کھرے ہوئے ہیں
شہباز نیئر/رحیم یار خاں

شور سے ایسا ڈر لگتا ہے
دشت ہی اب تو گھر لگتا ہے
کالی رات میں ننھا تارہ
چاند سے بھی بڑھ کر لگتا ہے
آپ ہمارا پیار ہیں صاحب
کیسے کہہ دیں، ڈر لگتا ہے
ایک نظر میں دل موہ لینا
تو بھی جادوگر لگتا ہے
عشق میں میرے شاہد یاسر
جاں جاتی ہے، سر لگتا ہے
شاہد یاسر/احمد پور شرقیہ

جب لہو خاک میں ملایا ہے
تب کہیں اک خیال آیا ہے
دل کی کہنہ زمین پر میں نے
ایک تازہ جہاں بسایا ہے
میں اُسے کس لیے تلاش کروں
وہ تو ہر چیز میں سمایا ہے

جس کو سینہ دکھایا کر کے چاک
اُس نے بھی آئینہ دکھایا ہے
یہ زر و مال، یہ جہاں، یہ نمود
اور کچھ بھی نہیں ہے، مایا ہے
بس یہی اک عمل ہے میرے پاس
دل کسی کا نہیں دکھایا ہے
کتنا رنگیں مزاج ہوگا یار
جس نے اُس شخص کو بنایا ہے
سہیل یار/لاہور

شدید بھیڑ میں بھی راستہ بنانا تھا
ترا بلاوہ تھا سو تیرے پاس آنا تھا
میں کامیاب نہیں ہو سکا کہانی میں
پری کو جادوگروں سے مجھے چھڑانا تھا
سوال یہ نہیں کیوں خواب گاہ میں آئی ہو
اصول یہ ہے کہ دروازہ کھٹکھٹانا تھا
یہ اور بات کہ اُترا ہے چاک سے اب کے
ہمارے کوزے کا گارا بہت پرانا تھا
ہم ایک ساتھ سفر کر رہے تھے گاڑی میں
اُسے کراچی مجھے خان پور جانا تھا
اظہر عروج/خان پور

کس کس طرح سے اُس کو تسلیم کر رہا ہوں
اپنے لکھے ہوئے میں ترمیم کر رہا ہوں
مجھ کو اگر ہے یونہی ٹکڑوں میں بٹ کے جینا
خود کو محبتوں میں تقسیم کر رہا ہوں
اک بے لکیر میں نے تصویر ہے بنائی
اک ان کہی کی شاید تفہیم کر رہا ہوں
تو نے دیا ہے مجھ کو جو زہر میرے ہمدم
کوثر میں کر رہا ہوں تسنیم کر رہا ہوں
کہتے ہیں دوش وحشی ہوتے ہیں عشق پیشہ
اک عمر سے میں اپنی تنظیم کر رہا ہوں
نزاکت علی دوش/لاہور

کیا بات بتانی ہے کیا بات چھپانی ہے
ہر شخص کے سینے میں پردرد کہانی ہے
اس طرز سے کرتے ہیں اظہار تمنا کا
پیغام محبت کا خوشبو کی زبانی ہے
ہم صبح کے بھولے ہیں گھر شام کو لوٹیں گے
اس درد کے صحرا میں کچھ خاک اُڑانی ہے
سب لوگ پرائے ہیں کب کون کسی کا ہے
دیوارِ غمِ دنیا اب خود ہی گرانی ہے
ہر لفظ کے باطن میں کچھ عکس بناتے ہیں
اُس چاند سے چہرے کی تصویر دکھانی ہے
اس عشق میں فیضی ہم صدمات سے گزرے ہیں
اور درد کی گلیوں میں کچھ خاک بھی چھانی ہے
بشارت علی فیضی/گوجرانوالہ

وہ اپنے آپ کو جب بن سنور کے دیکھتے ہیں
تو آئینے بھی انہیں آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
نہ پوچھو پاؤں پنچتی ہے کس قدر توبہ
وہ جب بھی میری طرف جام بھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے عشق میں جاں سے گزرنا پڑتا ہے
چلو، یہ کام بھی ہم آج کر کے دیکھتے ہیں
بڑا شدید قلق ہوتا ہے مسافت پر
جب اپنے پاؤں میں چھالے سفر کے دیکھتے ہیں

ملا کے خاک میں پہلے بناتے ہیں وہ گلاب
پھر ان میں حسبِ طلب رنگ بھر کے دیکھتے ہیں
سمجھ میں آتا نہیں کیا ہے میری صورت پر؟
تمام لوگ مجھے کیوں ٹھہر کے دیکھتے ہیں
یہ کون دشت سے گزرا ہے آج دیوانہ
بگولے جس کو زمیں سے اُبھر کے دیکھتے ہیں
شکستہ ناؤ سہی حوصلہ تو ہے مضبوط
اے شیوہ ہم کہاں طوفاں کو ڈر کے دیکھتے ہیں
محمد شریف شیوہ/لاہور

پینے کی بات کر نہ پلانے کی بات کر
ساقی نگاہِ شوق ملانے کی بات کر
دشتِ خرد سے باغِ جنوں تک میں آ گیا
ویران دل کو اب تو لبھانے کی بات کر
زُلفوں کے پیچ وخم میں اُلجھ کر میں رہ نہ جاؤں
یا مار دے مجھے یا بچانے کی بات کر
دنیا کی بے ثبات حقیقت پہ بارہا
میں رو چکا ہوں اب نہ رُلانے کی بات کر
دارِ فنا سے کانٹوں کو طاہر نے چن لیا
تو بھی نصیب اپنا جگانے کی بات کر
طاہر

راوی کا پُل

میں راوی کے پل پر سے جب بھی گزرتی ہوں
اس کا پانی مجھے تیرے جیسا لگتا ہے
جسے دیکھنا اور دیکھتے چلے جانا
مجھے اچھا لگتا ہے
اس پہ پڑتی سورج کی سرخ شعاعیں
تیرے چہرے پہ مکراہٹ کے سبب آتی
سرخی جیسی لگتی ہیں
اور جگہ جگہ اُبھرے خشک ٹیلے
تیری محبت میں شامل غصے جیسے لگتے ہیں
اور ہر جانب سے اُترتے عقاب
میرے لیے رقیبوں جیسے ہیں
میں جب اس پہ پڑتی سورج کی آخری کرن پہ
آخری نظر ڈالنے پر مجبور کر دی جاتی ہوں
تو دور جاتے جاتے مجھے ایک بے جان کر دینے والا
خیال آتا ہے
راوی کا پانی بھی تو مجھے تمہاری طرح
رفتہ رفتہ بچھڑتے جا رہا لگتا ہے
اور ایک دن خشک ٹیلے تیری بے وجہ ناراضی کی طرح
مستقل نہ ہو جائیں
پھر میں کیسے جی پاؤں گی کہ
دوہری موت مرنا طبعی موت مرنے سے مشکل ہوتا ہے
عائشہ نصر اللہ/لاہور

میرے پاس جوتوں کا ایک ہی جوڑا تھا
جسے میں
ایک دن قبل کالی پینٹ کے ساتھ
استعمال کر چکا تھا
اب اسے بھوری پینٹ کے ساتھ پہننا
پرلے درجے کی بدمذاقی ہوتا
لیکن کہتے ہیں نا:
جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے
یہ میری پانچویں محبوبہ تھی
جو میری ڈریسنگ اور خاص کر کنٹراس کی شیدا تھی
لیکن
وقت سدا ایک جیسا نہیں رہتا
مجھے نئی پینٹ کے ساتھ اس جوتے کو پہننا تھا
یا
الف رن سے اس کا جوتا ادھار مانگنا تھا
ادھار مانگی ہوئی چیزیں بھی کب تک ساتھ دیتی
وہ جوتا ہو یا توجہ
اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میں نے کہا
ادھار مانگی ہوئی چیزوں کی بھی تو مجبوری ہوتی ہے
آخر کب تک مستعار رہ سکتی ہیں
گھر واپسی کا سفر کسے عزیز نہیں
وہ بولے جا رہی تھی
اور برابر تکے جا رہی تھی
ہم نے کئی چیزوں کو اپنی خوشی سے اپنے گلے میں
اڑس لیا ہے:
محض سانس تنگ کرنے کو
مری نکٹائی کی گرہ کستے ہوئے وہ
بڑبڑائی
اور میرے شانے پہ سر رکھ دیا
اچانک اس کے گلے میں چمکتی ہوئی
چین کی طرف مری توجہ منعطف ہوئی
جس میں اُلجھی ہوئی لاکٹ
اب اس کی تنومند چھاتیوں کے
درمیان سہمی پڑی تھی
دونوں کی نظریں
ایک بے نام احساس سے دوچار ہوئیں
اور ہم

کڑوی کڑوی کافی کے سپ لیتے ہوئے
باتوں کے سحر میں گم ہو گئے

قمر عباس علوی/لاہور

تانا بانا

کبھی کبھی مجھے
باتوں کا ہجوم بولنے نہیں دیتا
لفظوں کے ڈھیر میرے اردگرد
اپنی سرمئی آنکھیں کھولے حسرت سے تکتے ہیں
کئی رال ٹپکاتے خیال
اپنی لپلپی زبانوں سے مجھے چھوتے ہیں
اپنی اور متوجہ کرتے ہیں
کبھی کبھی طلوع آفتاب سے پیشتر
یہ میری ہڈیوں اور گودے میں سما جاتے ہیں
کبھی کبھی تو مجھے دن بھر ان کا رہین منت رہنا پڑتا ہے
اور کبھی سرمئی شام کے گھٹتے بڑھتے سایوں میں
جب درخت اندھیرے کی چادر اوڑھ لیتے ہیں
لفظ اپنے سرخ چہروں سے مجھے گھورتے ہیں
ان کی حبس زدہ سانسیں میرا دم گھونٹ دیتی ہیں
پھر یہ میرے بدن کو اپنے خوفناک ناخنوں سے
کریدتے اور لہو کی ریگھاریاں بناتے ہیں
کبھی کبھی اپنے خبیث چہرے پر لجاجت سجا کر
میرے ہونے کی گواہی بنتے ہیں
میں اپنے ہی لفظوں کی دہشت گردی کا شکار ہوں
حروف کا تانا بانا مجھے جکڑے رکھتا ہے
ان کہے جملے، گرائمر وانشا کی سب اصطلاحیں
میرا منہ چڑاتی اور خوف کا شکار کرتی ہیں
میں وجودیت کے فلسفے سے باہر کسی ناسٹلجیا کا شکار
اپنے ہی روپ سروپ کی گرہیں کھوتے
اپنی ذات کی خاردار جھاڑیوں سے اُلجھی
اک غنودہ سی اُداسی میرے چاروں طرف
کسی عفریت کی مانند ہے
اک معصوم سی انکار کی چمک خود پہ سجائے
لفظوں کے گورکھ دھندے میں لپٹی پڑی
آزاد ہونے کی جستجو میں اور اُلجھتی جاتی ہوں
لفظ ادا ہونے سے پہلے ہی مجھے زخمی کرتے ہیں
کوئی تدبیر کارگر نہیں
زندگی اک سوالیہ نشان کے بیچ اُلجھی ہے
میں لفظوں اور حرفوں کے تانے بانے سے
باہر نکلوں گی تو آسمان آرزو پہ چمکتے ستارے
گن لوں گی

آسناتھ کنول/لاہور

غزل

راستوں کو غبار کرتے ہیں
ہم تو منزل سے پیار کرتے ہیں

صحنِ گلشن کو اپنی خوشبو سے
روز وہ مُشکبار کرتے ہیں

تیرے وعدے پہ ہے یقیں ہم کو
آنکھ پر اعتبار کرتے ہیں

میرے آنگن میں وہ کبھی آئیں
زینتِ صد ہزار کرتے ہیں

میری حسرت کا تجھ کو ہے معلوم
جلووں کا انتظار کرتے ہیں

اُن کی ہاں جانیے نفی کا نشاں
گر نفی بار بار کرتے ہیں

کاش اُن کو بھی ساتھ لے آتے
چارہ گر بے قرار کرتے ہیں

کاکل افشاں ہیں ان کے چہرے پر
چشمِ دل بے قرار کرتے ہیں

خالد مسعود/لاہور

ماہنامہ ''ارژنگ'' کی طرف سے
پاکستان کے معروف نعت گو شاعر
ادیب و دانشور
جناب محمد امین ساجد سعیدی
کو ان کے نعتیہ دیوان
''مدینہ یاد آتا ہے''
پر صدارتی قومی سیرت ایوارڈ ملنے پر
مبارک باد پیش کرتے ہیں

FA, BA, BSc, MA, PCS,
CSS, PPS Books سکول بکس
کالج بک ڈپو
اُردو بازار، لاہور
سکول و کالج کی کتب کا مرکز، لائبریری بکس
042-37357567/0300-4291823

سمندر پار سے

تم اپنا سامان اُٹھا کر لے جاؤ
پھولوں کے دالان اُٹھا کر لے جاؤ
رشتوں کی تضحیک نہیں کر سکتا میں
میرے سارے مان اُٹھا کر لے جاؤ
آوازوں کے شہر میں رکھی خاموشی
جتنی ہے آسان اُٹھا کر لے جاؤ
ان میں کچھ ہیں پر تتلی کے مت لینا
باقی سب گلدان اُٹھا کر لے جاؤ
مسجد مندر، گرجا گھر کے وحشی تم
اپنے سب بھگوان اُٹھا کر لے جاؤ
میں نے اپنی عمر گزاری ہے جس میں
آؤ وہ زندان اُٹھا کر لے جاؤ
مجھ کو گھٹ کر مر جانے دو کمرے میں
میرا روشن دان اُٹھا کر لے جاؤ
جگنو، تارے، تتلی اور پرندے ہوں
بستی سے انسان اُٹھا کر لے جاؤ

ایاز محمود ایاز/فرانس

معصوم ہیں سادہ ہیں کہ چالاک ہیں آنکھیں
چہرے کی مگر قیمتی پوشاک ہیں آنکھیں
تم آج مری آنکھ کی لالی پہ نہ جاؤ
گزری ہے کچھ ایسی ہی کہ نمناک ہیں آنکھیں
جن آنکھوں میں رہتے تھے محبت کے مناظر
کیوں مجھ سے خفا اور غضبناک ہیں آنکھیں
آنکھوں سے چھلکتا ہے یہ حسرت کا تصور
جو درد بسا ان میں تو خاشاک ہیں آنکھیں
فرحت تری آنکھوں میں رہے پیار کی دولت
چاہت کی یہ جاگیر ہیں املاک ہیں آنکھیں

فرزانہ فرحت/لندن

محبت زخم بھی دیتی ہے مرہم بھی لگاتی ہے
جو بجھتی ہی نہیں یہ آگ ایسی ہی لگاتی ہے
محبت کیا ہے ہر کوئی بھلا کب جان سکتا ہے
محبت کا جو قیدی ہو سمجھ اس کو ہی آتی ہے
نہ کچھ دن کو قرار آئے نہ راتوں کو ہی نیند آئے
نہ جانے کیوں اثر دل میں یہ ایسا چھوڑ جاتی ہے
کٹھن کتنے مراحل ہیں محبت کے ذرا سوچو
یہ ہمت عاشقوں کی ہے کہ پھر بھی ان کو بھاتی ہے
وہ عاشق خام ہیں فرقت کا جو بھی کرتے ہیں شکوہ
محبت وہ ہے جو بچھڑے ہوؤں کو بھی ملاتی ہے
جو تعبیریں ہیں اس کی وہ تو مل سکتی ہیں برسوں
ادھورے خواب ہر شب یہ مجھے ایسے دکھاتی ہے
محبت ہی تو کُل عالم کی ہے بنیاد اے ساحل
مرے دل کو تو ہر دم ہی محبت جگمگاتی ہے

ارشد نذیر ساحل/اسپین

کبھی خود سے خفا نہ ہونے دیا
میں نے اس کو جدا نہ دیا
یہ محبت کی قید تھی جس نے
زندگی بھر رہا نہ ہونے دیا
زیرِ بار اس قدر رکھا اس نے
عمر بھر بے وفا نہ ہونے دیا
کون تھا میرے اور خدا کے بیچ
جس نے یہ رابطہ نہ ہونے دیا
وہ بچھڑ کر بھی میرے ساتھ رہا
ہجر میں مبتلا نہ ہونے دیا
عام سا شخص تھا ظفر وہ تو
جس نے مجھ کو مرا نہ ہونے دیا

ظفر اعوان/ڈنمارک

ڈر کوئی میری ذات پہ طاری تو نہیں ہے
اُلفت ہے کوئی وقت گزاری تو نہیں ہے
آئینے تو صدقے میں اُسے دیکھ رہے ہیں
پھولوں نے نظر اس کی اُتاری تو نہیں ہے
ہر شخص اُٹھاتا ہے غمِ بارِ گراں یاں
سب کی ہے کہانی، یہ تمہاری تو نہیں ہے
مفلس ہوں مگر بے سرو ساماں تو نہیں میں
دولت مرے جذبات سے بھاری تو نہیں ہے
مانا کہ ہے دل صورتِ زیبا کا پجاری
ہر صورتِ زیبا کا پجاری تو نہیں ہے
دنیا کے لیے دین کو عقبیٰ کو بھلا دیں
یہ دنیا کوئی اتنی بھی پیاری تو نہیں ہے
دینی ہے اگر داد تو دل کھول کے دیجے
شاعر ہے عدیل آسی بھکاری تو نہیں ہے

عدیل احمد آسی/ڈنمارک

عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ڈوبی شاعری

ریاض ندیم نیازی/سی

نعتیہ کلام کے مجموعے تو اکثر و بیش تر شایع ہوتے رہتے ہیں مگر کچھ کتابیں دیکھتے ہی آنکھوں میں سما جاتی ہیں اور اُن کی شاعری دل میں اُتر جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک کتاب ''پیارے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کے نام سے شایع ہوئی ہے جو لاہور میں مقیم ملتان کے نوجوان شاعر جناب زاہد محمود زاہد کا پہلا نعتیہ شعری مجموعہ ہے، جس کی ابتدا حمدِ باری تعالیٰ سے کی گئی ہے۔ پیارے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں شامل نعتیہ کلام جذبے کی سچائی اور بیان کی سادگی کا آئینہ دار ہے۔ اس میں والہانہ عقیدت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موج زن ہے۔ خوش گوار حیرت ہے کہ نوجوانی میں کوئی شاعر لب و رخسار، گل و بلبل یا چمن و گل زار کے قصے بیان کرنے کے بہ جائے حضور اکرم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ عقیدت کا اظہار کرے اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفاتِ کاملہ اور اوصافِ حمیدہ بے پناہ سرشاری سے بیان کرے، ظاہر ہے جس شخص نے حضور اکرم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور ان کی زندگی کا مطالعہ بہ غور کیا ہوگا وہی شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادات و اطوار، سیرت و کردار اور چال رفتار و گفتار کو شعری پیرائے میں منظوم کر سکتا ہے۔ وہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات، واقعات، غزوات اور تہذیب و ثقافت اور کرامات کو احاطۂ تحریر میں لا سکتا ہے۔

قابلِ مبارک باد ہیں جناب زاہد محمود زاہد صاحب جنھوں نے لغو باتوں اور کھیل کود میں مگن ہونے کے بہ جائے نعتیہ اشعار کہنے کو اپنا وظیفۂ حیات بنایا۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ نوجوانوں کی عبادت بہت مقبول ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں تو ہر شخص ہی نماز، روزے کی طرف رجوع کر لیتا ہے، مگر زاہد محمود زاہد صاحب تو نوجوانی میں یہ کارِ عبادت سرانجام دے رہے ہیں۔

زاہد محمود زاہد کی حمد سے بھی احساس ہوتا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے عرفان کی کوشش میں انسان کے عقل و شعور عاجز نظر آتے ہیں مگر وہ پھر بھی جستجو میں لگا رہتا ہے اور جیسے جیسے اسے اللہ تبارک و تعالیٰ کے بارے میں معلومات اور آگاہی ہوتی رہتی ہے وہ حیرت و تعجب میں غرق ہوتا رہتا ہے۔

شاعرِ موصوف نے اپنی نعتوں میں شہرِ مدینہ کا ذکر جا بہ جا کیا ہے۔ شہرِ مدینہ جہاں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسمِ مبارک و اقدس محفوظ ہے جس کے سبب انوار و تجلیات کی وہاں بارش ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دربارِ نبی کی زیارت سے محبت و عقیدت کا جذبہ فزوں تر ہو جاتا ہے۔ یقیناً زاہد محمود زاہد نے ابھی تک زیارت روضۂ رسول نہیں کی ہوگی کیوں کہ ان کے دل کی لگن اور تڑپ بار بار شعروں میں ڈھل کر سامنے آ رہی ہے اور حاضری کی تمنا آواز لگا رہی ہے۔ اس طرح ہر مسلمان کے جذبات ارفع و اعلیٰ ہو جاتے ہیں اور اس کے عشق و محبت کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ خواب میں دیکھنا اور حقیقت میں دیکھنے میں دن رات کا فرق ہے۔ ان کے اشعار نسبتِ رسول کے سبب مدینۂ منورہ سے محبت کا تقاضا کرتے ہیں۔ خیالات کے ذریعے وہ اپنے آپ کو ایک دنیائے انوار و تجلیات میں محسوس کرتے ہیں تب ہی انھیں سرور اور دل کا چین ملتا ہے۔ جب کوئی شخص واقعی روضۂ نبی کو سر کی آنکھوں سے دیکھتا ہوگا تو اس پر انوار و تجلیات کی بارش کا کیا عالم ہوگا یہ تو وہی بیان کر سکتا ہے جو اس نور و رنگ و نکہت کی بارش میں نہایا ہو۔

زاہد محمود زاہد کی نعت کا ہر شعر ایک خاص جذبے اور مفہوم کے اعتبار سے دل کی دھڑکن بن جانے کی خوبی سے متصف ہے۔ نعت گوئی بھی ایک شعری کاوش ہے جو فکر انگیزی کی حامل نہیں، نہ اس میں کوئی نیا خیال پیش کیا جا سکتا ہے مگر حضور اکرم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق و محبت اور والہانہ عقیدت ایک ایسا مرکز و محور ہے جس پر ایک ہی جذبہ یعنی اُن سے نسبتِ خاص گردش کرتی رہتی ہے۔ شاعرِ موصوف کے اشعار میں خیالات تو وہی ہیں جو نعتیہ شاعری میں ہوتے ہیں مگر اسلوب بیان میں ندرت ہے اس لیے ان کے کلام میں شعریت اور سادگی کا حسن سمٹ آیا ہے۔

مدینہ منورہ کی رونقوں کے مقابل دنیا کی تمام بہاروں اور ان کی رومانی کیفیات کم تر ہیں۔ خاکِ طیبہ کو آنکھوں سے لگا کر جو روحانی مسرت اور قلبی سکون حاصل ہوتا ہے، جو عقیدت و محبت میں احساسات دل پر وارد ہوتے ہیں وہ بیان سے باہر ہیں۔ زاہد محمود زاہد صاحب نے بھی ان تمام خیالات کو والہانہ عقیدت سے منظوم کرنے کی کام یاب کوشش کی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اس نوجوان کا یہ کارِ خیر قبول فرمائے اور اس نعتیہ کلام کو ان کے لیے سامانِ بخشش و مغفرت بنائے۔ آمین

تاج محل.....محبت کا کنول

طاہرہ اقبال

اَمر ہوٹل آگرہ کا کشادہ ڈائننگ ہال کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔ بریک فاسٹ کے وقت کوئی نشست خالی نہ ملتی تھی۔ قطار در قطار بوفے میں مختلف ناشتے سجے ہوتے ٹھنڈے جوسز کی مشینیں، چائے کافی کی گرم بھاپ چھوڑتی ہوئی مشینیں مختلف فلیورز کے سریل، دودھ دلیا، بریڈ، آملیٹ، فرائی بائلڈ ایگز، کیک مٹھیاں بسکٹ، تازہ پھل، ڈرائی فروٹ، پوری حلوہ، پراٹھے، آلو کی بھجیا، چنے اور نجانے کس کس انداز کی پکی سبزیاں اور دالیں ان فور فائیو سٹارز ہوٹلز میں ویجی بوفے میں ڈشیز کی تعداد پوری کرنے کے لیے نجانے کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ ہاں پاپڑ بھی موجود رہتے تھے۔ گوشت کی شان تو پھر نرالی ہے۔ ایک جانور سے بیسویں کھانے تیار کرلو۔ قیمہ، کوفتے، پسندے، کڑاہی گوشت، بالٹی گوشت، اچار گوشت، قورمہ، شوربہ، سبزی گوشت، روسٹ بروسٹ، بجی، سٹیم تنوری، چرغہ، حلیم، نہاری، گردے، کلیجی کتنی قسموں کے کباب، چاول، سالن، چاہے دس فائیو سٹارز کی متعین ڈشز پوری کرلو جو ایک دوسری سے مختلف بھی ہوں۔ یہاں ہندوستان میں یہی کام دالوں اور سبزیوں سے لیا جاتا ہے جو سلوک گوشت کے ساتھ ہم پاکستانی کرتے ہیں وہی سلوک ان غریب النہاد جانوں یعنی دالوں، سبزیوں کے ساتھ وہاں ہوتا ہے۔

ناشتے میں مجھے تو اٹلی پسند آیا جسے سانبھر کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ مختلف دالوں اور آلوؤں کے قتلوں کا پتلا سا آمیزہ، سانبھر غالباً چاول کے آٹے سے بنی مخروطی مرکز والی ٹکیاں اٹلی اس میں ڈبو کر کھائی جاتی ہیں جسے گورے بھی شوق سے کھا رہے ہوتے، ہر صبح یہ ڈائننگ ہال مہمانوں سے بھرا ہوتا جن کے لیے انڈین، عربی اور مغربی طرز کے ناشتے سجے رہتے۔ مہمان جلدی جلدی ناشتے سے نمٹ کر بیرونی دروازے کی سمت بڑھتے جہاں کسی ہندو دیوی کا طویل قامت بت ایستادہ تھا۔ جس کے پہلوؤں سے مصنوعی آبشاریں بہتی تھیں اور جس سے پرے ٹورسٹ بسیں اور ٹیکسیاں کھڑی ہوتیں اور یہ سبھی بس ایک ہی رُوٹ پر جاتی تھیں ''تاج محل''

آگرہ کا یہ تاریخی شہر مغلوں کی پہلی راج دھانی جس کی شکستہ حال سڑکوں کے گرد غلاظتوں کے ڈھیر لگے رہتے تھے مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ کچ مچ بازاروں میں ہتھ ریڑھیوں، سائیکل رکشوں، آٹو رکشوں کی بے ہنگم بھیڑ اور شور لیکن سیاح ہیں کہ اسی شہد کے چھتے پر اُمڈے پڑ رہے ہیں۔ کیونکہ اسی گدڑی میں وہ لعل چھپا ہے جس کی کشش سے ہی سارک رائٹرز فیسٹیول اس سال یہاں منعقد کیا گیا تھا۔ کسی دکان دار سے، کسی رکشہ ڈرائیور سے کسی بھی شخص سے وہاں بات کرو تو ایک ہی سوال منتظر ہوتا۔

''پاکستان سے آئے ہیں تاج دیکھ لیا۔''

''ابھی نہیں دیکھا'' پوچھنے والا جیسے ہماری گستاخی پر حیرتوں میں ڈوب جھنجھلا جاتا۔

''ارے یہ کیسے ممکن ہے آگرہ پہنچ کر تاج دیکھے بنا کوئی کیسے رہ سکتا ہے۔''

جیسے آگرہ پہنچتے ہی تاج پر حاضری نہ دینا سوءِ ادب ہو۔ آگرہ کے شہری قوانین کی محبت کے آداب کی سخت خلاف ورزی ہو لیکن سارک فیسٹیول کے شرکاء کو صبر کا باٹ لگایا گیا تھا کہ کانفرنس کے اختتام پر تاج محل لے جانے کا پروگرام ابتداء میں ہی دے دیا گیا تھا۔ اسی لیے تاج سے پہلے ہم نے فتح پور سیکری کا قلعہ دیکھ لیا جسے شہنشاہِ اکبر نے صوفی سلیم چشتی سے ارادت کے جذبے کے تحت اُن کی درگاہ کے قصبے میں تعمیر کروایا تھا۔ اس قلعے کا بھی عجب ماجرہ ہے۔ میلوں پھیلے قلعے کے اندر پورا دارالخلافہ بسایا گیا تھا۔ یہ ۱۵۷۱ء سے ۱۵۸۵ تک مغلیہ دارالحکومت رہا۔ فصیل شہر کے اندر وزیروں، امیروں، لشکریوں اور دیگر حکام کی رہائش گاہیں بنائی گئی تھیں۔ یہاں دفاتر، عدالتیں، دیگر سرکاری عمارتوں کے علاوہ شاہی محل، حرم گاہیں اور مسجد تعمیر ہوئیں۔ ہم جس طویل و عریض دروازے سے داخل ہوئے وہ شکست و ریخت کے آخری مراحل سے دوچار تھا۔ فصیل کے ساتھ ساتھ شکستہ تاریخی عمارتیں اب غریب بستی کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ ایک ایک کمرے میں بڑے بڑے کنبے آباد تھے۔ اُکھڑے ہوئے فرش، دھوئیں سے سیاہ پڑی سرخ اینٹیں، غربت و افلاس کے گرد بار کی بھوت نگری جیسے کوئی۔

پرانے بوسیدہ درختوں تلے کئی مرد بے کار بیٹھے جیسے تاریخ کے بوسیدہ اوراق کی جگالی کرتے ہوں اور ان نہائے دھوئے بچے دھما چوکڑی مچا رہے تھے۔ عورتیں موٹی موٹی قدیم چوکھٹوں والے کالک زدہ دروازوں کی اوٹ سے جھانکتی تھیں۔ پرشکوہ تاریخ

اور عسرت کا عجب بے ہنگم ملاپ شاہی محلات اور تاریخی قلعوں پر ایسا افلاس برستا ہوا کبھی نہ دیکھا۔ شاید یہ ناجائز قابضین تھے یا شاید انھی شہزادے شہزادیوں کی اولادیں جنھیں خواجہ حسن نظامی نے بھیک مانگتے، ٹھیلے لگاتے، بٹھیارے دہکاتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاید انھی کے بھوت ان تاریخی عمارتوں کی شکستگی میں کہیں مقید ہو گئے ہیں۔ ہمارے گائیڈ نے خصوصاً تاکید کی تھی کہ ہمیں اپنی پاکستانی شناخت کو چھپانا ہے۔ اگرچہ فتح پور سیکری کا قصبہ آگرہ سے تقریباً بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے لیکن آگرہ کی میونسپلٹی میں شامل نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے پاسپورٹس پر اس شہر کی سٹمپ موجود نہیں تھی لیکن پرانے برگد تلے بیٹھے سفید ٹوپی اور کرتے پائجاموں میں ملبوس ان مسلمانوں نے دور سے ہی خوشی کے نعرے بلند کیے۔ ''آیئے آیئے! پاکستان سے آئے ہیں خوش آمدید''

جیسے کہتے ہوں ہم تو آپ کی آمد کے منتظر نجانے کتنی صدیوں سے اس آسیب زدہ قلعے میں چشم براہ کیے بیٹھے ہیں۔ اُنھی میں سے ایک صاحب ہمارے ساتھ گائیڈ کے طور پر چل پڑے۔ اس دارالخلافے کی بیشتر عمارتیں تو منہدم ہو چکی ہیں لیکن فصیل شہر بعد زمانہ کی دست برد کے سامنے ابھی ڈٹی کھڑی ہے۔ جس شہر کی حصار تھی وہ تو کب کا مٹ چکا لیکن یہ اپنے فرائض منصبی میں ابھی بھی مستعد کھڑی ہے۔ نجانے اس بیرونی دروازے کی اُونچائی کتنی تھی لیکن اتنی ضرور تھی کہ یہاں سے ہاتھی ہودوں سمیت گزرتے ہوں گے۔ ادھر دکن کی مہموں کے لیے لشکر، گھڑ سواروں اور توپ خانوں کے ہمراہ روانہ ہوتے ہوں گے۔ شہزادیوں کی پالکیاں اور شہزادوں کے تخت تشریف لاتے ہوں گے لیکن ہماری چھوٹی سی مارُوتی کار باہر ہی پارک ہوئی تھی جب کہ اندر میل ہا میل وسعت و کشادگی پھیلی تھی جس میں پارک، لان گراسی پلاٹ، بوڑھے قدیمی درخت، تازہ کھلے پھول، نوخیز پودے تاحد نگاہ پھیلے تھے۔ بلند فصیل سے جڑی کوٹھریاں شاید فوجی چوکیاں رہی ہوں گی۔ شاید پورا لشکر یہیں قیام کرتا ہوگا۔ سرخ پتھر سے تعمیر کنگرے دار تاریخی فصیل کے ساتھ ساتھ آباد غریب بستی کو چھوڑ کر ہم تارکول کی کشادہ سڑکوں کی سمت نکل گئے۔ یہ سڑکیں ڈھلانی تھیں۔ شاید شاہی محل بہت اُونچائی پر بنایا گیا ہوگا۔ شاہی محل سے دارالخلافے کے دفاتر تک برق رفتار گھڑ سوار پیغامات کی ترسیل انھی سڑکوں کے ذریعے کرتے ہوں گے۔ ان چڑھتی اُترتی سڑکوں پر مستعد غلام اور حسین کنیزیں چہلیں کرتے پھرتے ہوں گے۔ چھتنارے درختوں، کشادہ پارکوں اور باغوں میں کیسے معاملات، محبت و عناد، سازشیں اور منصوبے تیار ہوتے ہوں گے۔ یہ قلعہ بہت کم وقت کے لیے اکبر کا دارالخلافہ ہونے کا اعزاز حاصل کر سکا۔ پانی کی قلت کی وجہ سے دارالخلافہ لاہور منتقل کر دیا گیا۔ دکن کی مہموں کے دوران ۱۶۰۱ء میں اسے پھر تھوڑے عرصے کے لیے دارالخلافہ بنایا گیا۔ البتہ مغل بادشاہ محمد شاہ کے دور میں ۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء تک وہی پھر دارالخلافہ بنا۔ آج یہ دارالخلافہ بہت تنہا اور افسردہ تھا جیسے اپنے مکینوں کی یاد میں گم سم پچھلے پانچ سو برس تغیرات کا امین حیران و پریشان بڑے بڑے چمن زاروں اور کشادہ سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم اُس بس میں بیٹھے جو سیاحوں کو شاہی محل تک لے جاتی تھی۔ چاروں اطراف پھیلے سبزہ زار کہیں کہیں تاریخی عمارتوں کے خاموش آثار اکبر کے اس اُجڑے ہوئے شہر کی شام کو سوگوار بنا رہے تھے۔ دور سے ہی قوالی کی مخصوص آوازیں اُجڑے ہوئے دارالخلافے میں زندگی کی گونج کی طرح اُبھر رہی تھیں۔ سفید سنگ مرمر کے اس چھوٹے سے مزار کے کشادہ صحن میں قوالوں کی جماعت اپنی بھرپور فنکاری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ کیونکہ سلیم چشتی کے مزار کے تھڑے پر اُس وقت کے وزیر تجارت پاکستان امین فہیم اور ایک نوخیز حسین و جمیل لڑکی غالباً سیکرٹری اور بہت سے دیگر ملازموں کے ہمراہ تشریف رکھتے تھے۔ اکبر کی سلیم چشتی سے عقیدت و محبت کی انتہا کہ اس کوچہ تصوف میں اپنا دارالحکومت قائم کر دیا۔ آج یہ شکستہ دارالحکومت تو ویران پڑا تھا لیکن کوچہ تصوف آج بھی زائرین سے بھرا تھا۔ پھول اور عقیدت بھری چادریں چڑھانے والوں کی کمی نہ تھی۔ عجب ماجرہ عشق و دل ہے یہ بھی، یہاں سے کوئی ایک کلومیٹر کی دُوری پر شاہی ایوان سنسان کھڑے ہیں۔ بہترین ترتیب اور نظم و نسق کے ساتھ یہاں کئی شاہی عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ یہ انتہائی ویل پلینڈ شہر بنایا گیا تھا۔ یہیں اکبر کے نورتنوں کا ظہور بھی ہوا۔ یہیں ایرانی اسلامی طرزِ تعمیر میں مقامی اور ہندومت کے مظاہر کو بھی ہم آمیز کیا گیا۔ آگرہ کے قریب لال پتھر کے ذخائر موجود تھے۔ سو تمام عمارتیں اسی پتھر سے انڈین اور ایرانی طرزِ تعمیر کا نمونہ بنائی گئیں۔ شاہی محلات کئی ایوانوں پر مشتمل تھے، خیموں کا اسٹائل اسلامی طرزِ تعمیر کی یادگار ہے۔

ٹھہرے ہوئے پانی کے تالابوں پر تعمیر ایوانوں پر شام کے ڈھلتے سائے طلسم بن کر چھا رہے تھے۔ شاید یہ ایوانِ عام ہو جس کے مضبوط ستون پانیوں میں کھڑے تھے اور اُن کے اُوپر بے شمار دروں، زینوں، برآمدوں، غلام گردشوں، جالیوں، ستونوں، کشادہ محل کھڑا تھا۔ پھر اُس کے اُوپر شاندار تعمیر، پھر اس کے اُوپر اس طرح کہ ہر ایک ایوان کے سامنے کشادہ صحن موجود رہتا۔ یوں ہر منزل دوسری سے بہت پیچھے ہٹتی چلی جاتی۔ ہر منزل پر اکا دُکا سیاح گھوم رہے تھے۔ محل کے سرخ پتھروں پر ڈوبتے سورج کی شفق، اساطیر کے پرانے کھلے ورقوں میں آگ دہکا رہی تھی جیسے یہ محل کے ایوان نہ ہوں کسی مصور کی تخلیق کو سرخ رنگوں نے سینچ دیا ہو۔ اسی ایوان میں خیموں کی عکاسی کا عنصر شامل ہے۔ چوگردشی نہر کے گرد تعمیر یہ ایوان کسی سوگوار نظم کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ کسی افسردہ دیوی کی طرح کسی خاموش مغنیہ کی طرح۔ کسی اُداس سُر کی طرح، سورج ڈوب رہا تھا۔ تالابوں میں ٹھہرے کا ہی زدہ سبز پانیوں میں سرخ پتھر کا عکس آگ دہکا رہا تھا۔ مختلف ایوانوں میں کتنی فن کاریاں، باریکیاں، نزاکتیں اور نفاستیں پتھروں کی نازک کٹائی، جالی ورک، گولائیاں اور چھدائیاں اتنی فن کاری اور خوبصورتی کہ لال قلعہ دلی مجھے تو اس کے مقابل بہت کم لگا اور لاہور کا شاہی قلعہ تو بس ایک قدیم تاریخی عمارت تخیل دھوکہ کھاتا تھا کہ قلعہ میں باقی بچ رہے یہ شاہی ایوان کیا حقیقی محلات ہیں یا مصورانہ تخلیقات، سرخ پتھروں کا عجب آرٹ جو اکبر اعظم کے گنگا جمنی عقائد کا عکاس ہے۔

دیوی دیوتاؤں کی شبیہوں سے مزین ایک عالی شان مندر بھی جو جودھا بائی کے لیے تعمیر ہوا تھا، جودھا بائی کا رہائشی محل بھی یہیں تھا جس کی طرزِ تعمیر میں سرخ پتھر کی عجب ماہرانہ کٹائی سے جھالریں، کنگرے، قوسیں اور Corves بنے تھے۔ یہاں تنہا کئی ایوان، لیکن تالابوں کے کناروں کھڑے محلات جن کے درمیان بنے تخت کو رواں پانیوں کے اُوپر سے گزرتی کشادہ سڑکیں مختلف ایوانوں سے ملاتی تھیں۔ یہاں شہزادیاں دبیز غالیچوں پر گاؤ تکیے لگا بیٹھتی ہوں گی اور نیچے بہتے حوضوں اور نہروں میں شنگرخی بجرے رواں رہتے ہوں گے۔ روشوں پر سے حسین کنیزیں کامدانی پشوازیں لہراتی کورنش بجالاتی ہوں گی۔ عجب منظر ہوگا۔ پرشکوہ حسن، پرجلال اقتدار، سب فنا، معدوم، قوالی کی صدا مزید تیز ہوگئی تھی۔ سبز پانیوں میں سرمئی اندھیرا گھل رہا تھا۔ سرخ پتھروں سے تراشیدہ فن پارے، ماضی کی یاد میں عنابی اُداس چہرے لیے یہ محلات بالکل خالی اور تنہا کھڑے تھے۔ عجب سوگوار اور پروقار حسن، کیا روئے زمین پر کوئی چیز ان سے بھی خوبصورت ہوسکتی ہے۔

''ارے تاج نہیں دیکھا آپ نے۔'' عقب سے سفید ٹوپی اور کرتے پائجامے میں ملبوس گائیڈ سرخ پتھروں کی شفق میں بھڑک اُٹھا۔ ''نہیں ابھی نہیں'' ''واہ! کیسے صبر کیے بیٹھے ہو۔ تاج دیکھو گے تو باقی سب بھول جاؤ گے۔''

تاج محل برعظیم کے ہر باشعور شخص کی فنٹسی جس سے وابستہ متھ نے دورِ افتادہ اس پسماندہ گاؤں میں بستے میرے بچپن پر بھی اپنے پروں کے سائے پھیلائے رکھے اور اب یہاں ہر ایک روک روک پوچھتا تھا۔ ''تاج دیکھا''

جس رکشہ ڈرائیور نے ہمیں گرینڈ ہوٹل سے کانفرنس کے اختتام پر اُٹھایا وہ مسلمان تھا۔ لگتا تھا یہاں سفید ٹوپی پہن کر مسلمان اپنی شناخت کروانے کے درپے ہیں۔ اُس آٹو ڈرائیور نے ہمیں پاکستانی جان کر ہمارے اسلامی جذبات خوب مشتعل کیے۔

''ایک پاکستان تو وہ ہے جہاں سے آپ آئے ہیں اور ایک چھوٹا پاکستان یہاں آگرہ کے قلب میں واقع ہے جہاں پاکستان کے یومِ آزادی پر جھنڈا لہرایا جاتا ہے کسی شیوسینا کی کسی اکالی دل کی جرات نہیں کہ اس چھوٹے پاکستان کی حدود میں دخل اندازی کرے۔''

ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہمارے جذبات کو کیوں بھڑکا رہا ہے لیکن ہم میں سے کوئی بھی اُسے ٹپ دینے کے موڈ میں نہ تھا لیکن یہاں مسلمانوں کی مجموعی حالت انتہائی دگرگوں ہے۔ غربت، گندگی، جہالت ان چھوٹے پاکستانوں کا عمومی چہرہ ہے۔ ایسے ہی ایک چھوٹے پاکستان کی ایک تنگ و تاریک دکان کے سامنے اُس نے ہمیں لے جا اُتارا اور اپنے بھائی بند کو آواز لگائی۔

''میم لوگ پاکستان سے آئے ہیں کیلے کے چھلکے کی اچھی اچھی ساڑھیاں انہیں دکھاؤ۔'' وہ مصر تھا کہ ہم آگرہ کا یہ نایاب تحفہ ضرور خریدیں لیکن ہم کیلے کے چھلکے سے بنی ان اکڑی ہوئی گاڑھے رنگوں کی ساڑھیوں کو خریدنے میں کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ پھر اُس نے آگرہ کا پسندیدہ سوال کیا۔ ''تاج دیکھ آئے'' ''نہیں ابھی نہیں'' ''ارے نہیں دیکھا تو پہلے وہیں چلیے۔''

لگتا تھا جیسے سبھی کو ہمارے تاج نہ دیکھنے سے

ڈپریشن لاحق ہو رہا ہے۔ ہم پچھلے پانچ دن سے آگرہ میں مقیم تھے لیکن تاج کے دیدار سے محروم تھے تو تعزیرات جمالیات کی رُو سے سنگین جرم کے مرتکب ٹھہرے تھے۔ اب تو تاج سے چڑسی ہونے لگی تھی۔ جوابی وار کیا۔ ''تاج سے بھی زیادہ خوبصورت چیز دیکھی ہے ہم نے۔'' سفید اسلامی ٹوپی کے نیچے لال لال آنکھیں پھٹ گئیں۔

''بھئی اس دنیا میں تو تاج سے خوبصورت دوسری کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔''

''ہے نا فتح پور سیکری کا قلعہ'' ''ارے وہ! ہندوانہ کلچر کی یادگار جودھا بائی کا خوشامدی شہکار، اکبر کے دین الٰہی کی تعبیر۔'' وہ ہماری نالائقی پر اسلامی ٹوپی کے اندر اندر مسکرایا۔

''لیکن کاری گری تو دیکھو، پُرکاری اور فنکارانہ عظمت تو دیکھو.....'' اُس نے سامنی گاڑی میں ٹھکتے ٹھکتے زور سے بریک لگایا۔

''اس کے بنانے والے تو انجینئرز ہوں گے نا، لیکن تاج محل تو کسی شاعر کا تخیل ہے کسی مصور کی تخلیق ہے، کسی سنگ تراش کا الوہی مجسمہ ہے واہ! آپا آپ دیکھئے تو سہی سب بھول جائیں گی۔ تاج عجب تعویذ ہے جس کسی کی آنکھوں سے مس ہوتا ہے تو باقی سب نظارے دُھندلا جاتے ہیں۔''

''ارے یہی تو..... اعل سے وابستہ رومانی داستانوں نے ہی تو اسے یوں بڑھا چڑھا کر پیش کر رکھا ہے کہ باقی سب کو کیموفلاج کر گیا ہے۔ دیکھے اَن دیکھے اس عشق کی یادگار پر سب عاشق ہیں۔ ہم برصغیر کے باسی جس پتھر کو چاہیں خدا بنالیں اور پھر اُس کی پرستش کے لیے جتنے چاہیں پجاری اکٹھا کر لیں۔ ہمارے عقائد جس قدر سخت ہیں اتنے ہی لچکیلے بھی۔''

اب تو اندر ہی اندر تاج سے مخالفانہ جذبات اُبھرنے لگے تھے جس نے فتح پور سیکری کے لامثال سوگوار حسن کو بھی کیموفلاج کر لیا تھا۔ ان آگرہ والوں کی گفتگو کا سوتا تو جیسے آگرہ کے منبع سے ہی پھوٹتا ہے جس سے ملو ایک ہی سوال ''تاج دیکھا، ارے ابھی تک نہیں دیکھا تو پھر کیا دیکھا۔''

سارک رائٹرز کانفرنس میں شرکت کی دعوت جب ملی تھی تو سب سے پہلا ردِعمل یہی تھا۔ نہیں فراغت نہیں ہے جانے کی، لیکن اس دعوت میں ایسا لاسہ چھپا رکھا تھا کہ بال و پر پھڑ پھڑانے کی جرأت نہ ہو پائی تھی۔ اس بار یہ کانفرنس آگرہ میں منعقد ہونا تھی، جہاں کہیں تاج محل بستا ہے۔ کانفرنس کے اختتامی سیشن کے بعد معلوم ہوا کہ کل کا دن ہماری زندگیوں میں بہت اہمیت اختیار کر جانے والا ہے۔ کیونکہ ہم تاج محل کی سیر کو جا رہے ہیں۔

انتہائی گنجان آباد کوڑے کرکٹ اور مکھیوں سے بھری ٹوٹی پھوٹی سڑکوں والے علاقوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک وسیع و عریض پارکنگ میں جا کر بسوں سے اُترے۔ یہاں سے بگھیوں پر سوار ہو کر لوگ کہیں کو جا رہے تھے۔ ہم سمجھے تاج محل کو یہ بگھیاں جاتی ہوں گی۔ اس شاہی یادگار تک شاہی سواروں کو ہی جانے کی اجازت ہوگی۔ یہ دھواں چھوڑتی پٹرول پیتی، شور مچاتی مشینیں تو شاہی جوڑے کی نیند میں مخل ہوتی ہوں گی لیکن جب بگھیوں سے اُترے تو معلوم ہوا کہ سامنے جو بلڈنگ موجود ہے یہ تاج کو لپیٹے ہوئے نہیں ہے بلکہ تاج محل کو جانے والے وزٹرز کے پاسپورٹس اور دیگر شناختیں یہاں چیک کی جاتی ہیں اور جو شک و شبے سے بالاتر قرار پاتا ہے اُسی کو تاج کی زیارت کا پروانہ جاری ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش، بھوٹان، نیپال، مال دیپ، حد افغانی بھی کلیئر ہو گئے لیکن سدا سدا کے مشکوک لوگ پاکستانی روک لیے گئے لیکن جانا تو سبھی کو اکٹھے ہی تھا۔ اس لیے کلیئر ہو چکے بھی وہیں رُک گئے۔

یہاں ایک ہجوم تھا جو کاغذات کلیئر کروا کر لمبی لمبی ٹرامز میں سوار فتح مندی کے پھریرے لہراتے ہوئے ہماری نگاہوں کے سامنے تاج کو جاتا تھا۔ ایک ہم تھے کہ عمارت کے سامنے بچھی فٹ پاتھوں پر اُداس اور ناکام بیٹھے تھے۔ تبھی ایک نوعمر لڑکا گھوڑے کے ماسک پر سوار کرتب دکھاتا ادھر آ نکلا جس کا ساتھ ایک ڈھولچی دے رہا تھا۔ افغانیوں نے اس ڈھول کو اپنے قبضے میں لیا اور خٹک ڈانس کی بیٹ پر پورا افغانی گروپ رقص کرنے لگا۔ بس پھر کیا تھا پاکستانی دھمال پارٹی کو تو یوں لگا جیسے یہاں تاج محل کے شہر آگرہ میں اُن سے دوبارہ کشمیر چھن گیا ہو۔ وہ بس میں سے اپنا ذاتی ڈھول اُتار لائے اور اب جو بھنگڑے کی تھاپ بجی ہے تو دھمک دور تک گئی۔ سیکڑوں ہزاروں کا مجمع پل بھر میں گرد جمع ہو گیا۔

عجب سماں بندھ چکا تھا۔ وہاں موجود بیشتر سیاح اپنے پاسپورٹس اور دیگر شناختی دستاویزات چیک کروانے کا عمل اِلتوا میں چھوڑ کر اس بھنگڑا ناچ میں شریک ہو چکے تھے۔ نیپال، بھوٹان، مال دیپ کی رائٹرز لڑکیاں جین شرٹس میں ملبوس، ساڑھی بندی والیاں چوڑی دار پائجاموں اور گھیر دار فراکوں والیاں ہم پاکستانی خواتین بھی ایک طرف دُبکی کھڑی تھیں۔ نیلی پیلی پگڑیوں والے سکھ، گھیر دار

شلواروں والے افغانی، نیلی آنکھوں والے گورے اور گوریاں ایک انٹرنیشنل رقص کا نمونہ پیش کیا جا رہا تھا۔ رقاصوں کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا۔ تالیاں بجانے والوں کی دیواریں کنکریٹ ہو چلی تھیں۔ نئے آنے والے ڈھول کی بیٹ سے بندھے انسانی دیواروں کے روزنوں سے جھانکتے اور بے اختیار رقص کے دائرے میں شامل ہو جاتے تو کچھ تالیاں بجانے والوں میں..... بھنگڑا تھاپ نے ایک خود فراموشی کا ماحول طاری کر رکھا تھا۔ ہر سرگرمی تھم گئی تھی جاری کام التوا میں چلا گیا تھا۔ بس ایک ہی ضروری کام بچا تھا۔ بھنگڑا، بھانگڑا، جھومر، گھومر، بے پناہ خوشی اور بے قابو جذبات کا بے اختیار اظہار بھنگڑا، جس کی نزاکتوں کو سیکھنے کے لیے برسوں کی ریاضتوں اور پیشہ ور اُستادوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بس اندر سے، دل سے، رُوح سے کوئی الوہی سا جذبہ پھوٹتا ہے اور ہاتھ اور پیر دیوانہ وار ڈھول کی مخصوص بیٹ کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ مغلوں کی پہلی راج دھانی اُتر پردیش کے اس تاریخی شہر آگرہ میں پنجاب کے شوخ رنگ بکھرے تھے اور مادھول لال کے دربار کے دھمالی اپنے لمبے چمکدار پٹوں اور پھر تیلے جسموں کے ساتھ مرکز نگاہ تھے۔ گزشتہ شب سارک ممالک کے ثقافتی شو میں وہ صوفیانہ دھمال سے بھی ثقافتی طائفوں کو پچھاڑ چکے تھے۔ اس وقت بھی تماشائی تاج محل کی زیارت کے بے تابانہ دباؤ سے کسی حد تک باہر نکل آئے تھے۔

تبھی نور سجاد ظہیر سراسیمہ سی چلی آئی تھیں۔ رائٹرز فیسٹیول میں وہ کو چیئر پرسن تھیں۔ وہ پاکستانیوں کے پاسپورٹس اُٹھائے لائی تھیں اور تیزی سے عمارت کے اندر چلی گئی تھیں۔ اب انتظار کی کوفت شروع ہو گئی تھی اِدھر اُدھر تانک جھانک شاید کہیں سے تاج محل کی کوئی کترن کوئی جھلک پڑ جائے۔ پارکنگ سے بگھیوں میں سوار ہو کر یہاں پہنچنے اور اس آفس کے اردگرد پچھلے ڈھائی تین گھنٹے گزارنے کے دوران ایک ہی سوال حیران کیے جاتا تھا۔ تاج محل ہے کہاں؟ کہاں چھپا رکھا ہے اس تاج محل کو کہانیوں، روایتوں، شاعروں، مصوروں، سنگ تراشوں کے متخیلہ کی مہمیز کو ہم میں سے ہر کسی کے بچپن کی طلسم نگری، نوعمری کا خواب نگر، پختہ عمری کا حیرت کدہ، تاج محل نظاروں کی پہلی چاہت، محلات کا تاج..... تاج محل جس کی تعمیر، ڈیزائن، اخراجات، عرصہ تعمیر، کاریگروں کی مہارت اور فن کاری، اتنی حیرت ناکیاں، میتھ اور فنٹسی ہمارے گوہر نایاب کو حافظوں کا سرمایہ تھی اور وہ سبھی احساسات جو حصول سے بالاتر چیزوں سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ آج ہم اس سب کا نظارہ کرنے والے تھے۔ اس احساس کا دباؤ ہی بدن میں سنسنی پیدا کرتا اور متخیلہ کو ایک مرکز پر لا کر جھنجھوڑ ڈالتا تھا۔ تاج محل محلوں کا تاج جسے ۱۹۸۳ء میں یونیسکو نے عجائبات زمانہ میں شامل کر لیا ہے۔ جس کی تعمیر ۱۶۳۲ء میں شروع ہوئی اور ۱۶۵۳ء میں مکمل ہوئی اور جس کے کاریگروں کی محنت یوں تمام ہوئی کہ اس کے بعد ان کی ہمتیں جواب دے گئیں۔ اسی لیے اس جیسا معجزہ دوبارہ ظہور پذیر نہ ہو سکا۔ اتنا سرمایہ صرف ہوا کہ مغلیہ خزانے خالی ہو گئے۔ ممتاز محل کی محبت نے جسے یوں سیراب کیا کہ لازوال بنا دیا۔ گوہیر بیگم ایرانی شہزادی جو چودھویں بچے کی پیدائش کے دوران مر گئی تو شاہ جہاں دو مہینے تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا اور جب اس حزن گاہ سے باہر آیا تو سر کے تمام بال سفید ہو چکے تھے۔ پھر اُس نے اپنی محبت کی اس انتہا کو رہتی دُنیا تک زمین کے سینے پر نقش کرنے کا فیصلہ کیا اور محبت کے غیر مرئی احساس کو مجسم شکل میں منتقل کر دیا۔ تاج محل بارگاہِ محبت، تاجوں کا تاج جس پر شاعروں نے شعر کہے انشاء پردازوں نے نثر پارے تخلیق کیے۔ مصوروں نے مرقع کھینچے، سنگ تراشوں نے مجسمے تراشے، ہر پریمی نے اپنی پریمیکا کو تحفے میں اس ماڈل کو پیش کیا۔ گھروں میں اس کی شبیہ سجائی گئی۔ قالینوں، کپڑوں، برتنوں پر اس کا ڈیزائن کندہ کیا گیا۔ اس کی نقل میں عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ محبوباؤں نے بیویوں نے طعنہ دیا۔ ''تم کون سا میرے لیے تاج محل بنا لو گے'' تو ساحر لدھیانوی پکار اُٹھا۔

اک شاہ نے بنا کر تاج محل
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

قصہ گوؤں نے کہا تاج کو آپ دیکھیں گے تو اُسے دل میں بسا کر ساتھ لے جائیں گے۔ تاج محل کو دیکھنا کوئی معمولی نظارہ نہیں ہے۔ وہ خوش سمت اور مقدر کا دھنی ہے جس کی نظریں اس عظیم نظارے سے ہم کنار ہوتی ہیں اور آج ہم یہ غیر معمولی نظارہ کرنے جا رہے تھے۔ آج ہم بھی مقدر کے دھنی کہلانے والے تھے۔ آج ہماری نظریں اس عظیم نظارے سے گراں بار ہونے کو تھیں۔ نور سجاد ظہیر معاملات طے کر کے اس وسیع عمارت سے باہر نکل رہی تھیں۔ اب ہمیں اُن ٹرامز پر سوار ہونا تھا جو ہماری نظروں کے سامنے پچھلے تین گھنٹے سے فاتحین کی شاہانہ سواریوں کی طرح رُخصت ہو رہی تھیں۔

بگھیوں پر سوار ہو کر اِدھر اُدھر تاج کی متلاشی نگاہیں بھٹکتی رہی تھیں۔ شاید کہیں تاج کا کوئی ذرہ کوئی کونا نگاہ کی حد کو چھو جائے اور اب یہاں ٹرامز پر سوار متجسس نظروں سے تاج محل کو سب ڈھونڈتے تھے لیکن وہ تو محلوں کا تاج ہے۔ تاجوں کا تاج ہے یوں آسانی سے نظر کے تیر کا شکار تھوڑی ہوگا۔

ٹرام نے جہاں اُتارا وہاں سڑک کے اطراف بنی دُکانوں میں نوادرات بھرے تھے۔ خواتین دُکانوں میں گھس گئیں۔ اللہ! تاج کے راستے میں کیسی کیسی رکاوٹیں حائل کر رکھی ہیں۔ ان ترغیبات سے دامن چھڑا کر کئی داخلی دروازوں والے واک تھرو گیٹ کی سمت بڑھے۔ چیکنگ کے مراحل سے گزرنے کے بعد نگاہیں پھر متلاشی ہوئیں۔ اب تو تاج نظر آنے کو ہی ہے یہیں کہیں اِردگرد ہمارے آس پاس ہم کتنا اہم اور خاص محسوس کر رہے تھے خود کو لیکن ابھی عشق کے امتحان اور بھی تھے۔ دائیں ہاتھ پردے لگا کر چھوٹے چھوٹے کیبن بنائے گئے تھے جہاں خواتین گارڈز نے بھرپور تلاشی لی۔ جسموں کی، کپڑوں کی، پرسوں کی، ان تمام مراحل سے گزارا گیا جن سے گزرتے ہوئے ایئرپورٹس پر بدمزہ اور زِچ ہو جاتے ہیں لیکن تاج کی کشش کہ یہ درگت بھی بری نہ لگی۔ طویل لائنوں میں لگنے اور تلاشی کے مراحل سے گزرنے کے بعد جب باہر نکلے تو سامنے مغلیہ طرز کا وسیع و عریض باغ تھا، جس میں داہنے ہاتھ سرخ پتھروں سے بنا روشن چراغ سا بلند و بالا بیرونی دروازہ کھڑا تھا۔ پورا گروپ بے تابانہ اُسی سمت بڑھا۔ یقیناً تاج اسی کے اندر کہیں چھپا تھا، لیکن پھر روک دیا گیا۔ معلوم ہوا ٹکٹ چیک کیے جا رہے ہیں۔

آخر تاج محل کو اتنا چھپا کر کیوں رکھا جاتا ہے؟ بتایا گیا کہ بابری مسجد کی شہادت کے بعد تاج محل کو انتہا پسندوں کی جانب سے خطرہ لاحق ہے۔ معبد گاہوں سے مخاصمت تو مذاہب کی تقابلی ضرورت ٹھہری لیکن محبت گاہوں سے دُشمن کن نفرتوں کی زائیدہ ہے۔ گروپ کے اراکین وہیں تراشیدہ باڑوں، پھولوں کی کیاریوں اور مغلیہ طرز کی روشوں کے جلو میں تصویریں بنانے لگے کہ آخر تو یہی باغ ہے جو تاج محل کو سمیٹے ہوئے تھا۔ اسی کی آغوش میں کہیں تاج چھپا تھا۔ آخر کار حکم ہوا کوچ کرو، پورا گروپ لال پتھروں سے تعمیر، بغلی چوبرجیوں والے بلند و بالا گیٹ کی سمت رواں ہوا اور داخل ہوتے ہی پتھر ہو گیا۔ تاج یک بارگی پورے کا پورا ہماری بصارتوں میں گھسا چلا آتا تھا۔ کوئی جگمگ ہیرا جیسے بہترین تراسوں والا دودھیا موتی شعاعیں چھوڑتا ہوا۔ تمبر کی تیز دھوپ میں نہایا ہوا چاندی کا بجرا، اتنا شفاف، اس قدر نیا، اتنا تر و تازہ، اتنا قریب، اس قدر مکمل اور شگفتہ آنکھ کے گل دان میں کھلتا ہوا شاداب کنول، ادھ کھلی نازک پنکھڑیوں پہ دھرا ہوا پورا چاند، آنکھ کے تل میں سماتا ہوا جہانِ حسن آبِ شبنم سے بھری سفید گلاب کی کٹوری جیسے، شفاف چھلکتا ہوا کرسٹل کا جام، دم سادھے، سانس روکے ساری حسیات بصارتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ کیا آنکھ کی اس ذرا سی پتلی میں اتنی کشادگی اتنی تابناکی سہارنے کی اہلیت بھی کہیں چھپی تھی؟ آنکھ سمندر میں یہ براق بجرا ہلکورے کھاتا ہوا۔ تاج محل مغلیہ طرزِ تعمیر کے بہت نظارے کیے اس نور کی چٹکی نے، لال قلعہ، جامع مسجد، قطب مینار، ہمایوں کا مقبرہ اور بہت کچھ لیکن جستہ جستہ سلسلہ بہ سلسلہ، آگے پیچھے، دائیں بائیں پھیلے ہوئے مناظر آنکھیں پھٹی بھی، حیران بھی ہوئیں لیکن ذرہ ذرہ، بتدریج آہستہ آہستہ ایسا تو کبھی نہ ہوا کہ مجسم حسن، مجسم حیرت، مجسم طلسم، مجسم سحر، مجسم چاند، مجسم سورج، ایک ہی نظارے میں سب ہم آمیز گھسے چلے آئیں۔ ایک مکمل جہان، ایک بھرپور تکمیل، سنگِ مرمر سے تراشا ہوا یہ شاداب پھول آنکھ کے گل دان میں یوں آن کھلا تھا جیسے یہ اُسی کے ناپ کا قالب ہو۔ کیا یہ تاج ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی کرتا ہے، جیسے ہی آپ بیرونی دروازے میں داخل ہوتے ہیں تاج فضاؤں میں تیرتا ہوا آپ کی نگاہوں میں لبالب جست بھر کر سما جاتا ہے۔ وہاں کے قصہ گو کہتے ہیں ''آپ تاج کو اپنے دل میں سما کر اپنی آنکھوں میں بسا کر لے جائیں گے اور پھر عمر بھر اسے خود سے الگ نہ کر پائیں گے۔

اب ہم تاج کی سمت بڑھے تو تاج پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ جو ہاتھ بھر کی دُوری پر دکھائی دیتا تھا وہ بہت دور ہو گیا۔ ہم بڑھ رہے تھے تاج ہٹ رہا تھا۔ سرخ پتھر کی روشوں کے دونوں اطراف تراشیدہ باڑیں اُن سے پرے کھلے ہوئے چمن زارِ دونوں روشوں کے درمیان شفاف پانیوں سے بھری کشادہ نہر فواروں سے چھلکتی۔ تو ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ تاج پیچھے ہٹ رہا تھا۔ سب سے پہلے ہمیں اُس چاندی سے چبوترے نے روکا جو ایک کشادہ حوض کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے تھا۔ سفید براق سنگ مرمر کے اس تخت پر بے داغ سفید پتھروں سے بنچ بنے تھے جو دھوپ میں قلعی شدہ ظروفوں کی مانند جگمگ تھے،

جن پر بیٹھ کر جوڑے تصویریں بنوا رہے تھے۔ فوٹو گرافر گلوں میں کیمرے لٹکائے گھومتے تھے۔ قصہ گو تاج کی رومانی داستان سناتے تھے۔ سفید سنگ مرمر کے یہ دو تخت جس حوض کو گھیرے ہوئے تھے اس کے دائیں بائیں نہریں نکلتی تھیں۔ یہاں کا سارا منظر جنت ساوی کے قرآنی تصور کو پیش کرتا ہے۔ حوضِ کوثر سے نکلتی تسنیم اور سلسبیل یہاں سورہ فجر کی یہ آیت کندہ ہے "وَادخُلنی جَنّتی" جس کا ترجمہ ہے (اور داخل ہو جا میری جنت میں) اور ہم جنت میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ جنت ارضی زمین سے بہت اُوپر کہیں بلندیوں میں لیے جاتی تھی۔ عجب احساس تھا جیسے خدا کی صناعی کا یہ ٹکڑا ابھی تازہ تازہ زمین سے پھوٹا ہو کہ عرشوں سے اُتارا گیا ہو۔ شاید یہ اس آیت قرآنی کے تعویذ کی برکت تھی کہ داخل ہونے والے اُنھی حیرتوں اور احتراموں سے آگے بڑھ رہے تھے کہ وہ جنت میں تشریف لاتے ہوں۔ شاہ جہاں اور ممتاز محل کی محبتوں کی لامثال جنت ارضی اس چبوترے پر جنتیوں کی بھیڑ تھی۔ ان سب کو جنت میں داخلے کے پروانے مل چکے تھے۔ یہاں سے تاج کا نظارہ بدل گیا تھا۔ اب تاج محل بہت بلند کہیں فضاؤں میں اُستوار نظر آتا تھا جیسے پنکھ پھیلائے راج ہنس کو کہا جاتا ہے۔ تاج اپنے رنگ اور موڈ بدلتا رہتا ہے۔ دن کے مختلف اوقات میں بدلتے موسموں میں دن رات میں شاید اس لیے کہ یہاں ایسی آیات کندہ ہیں جن میں وقت کے بدلتے مزاجوں کی خدا تعالیٰ نے خود قسم کھائی ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف رنگ کبھی دودھیا، سپیدۂ سحر سا، کبھی زرد دوپہری سورج سا۔ کبھی دُھند میں لپٹا ڈھلتی شام سا شاید سورہ فجر، الشمس جیسی آیات کی تاثیر ہے یہ تاج محل کا کنواں براق سفید ہے لیکن اردگرد پھیلے مناظر اُسے کئی رنگوں میں لپیٹے ہوئے ہیں۔ پھولوں کے شوخ رنگ حوضِ کوثر سے نکلتی سلسبیل اور تسنیم کے سبز نیلے موتیا رنگ کہتے ہیں بارش میں بھیگے تاج کی چھب نرالی ہے جب وہ قوسِ قزح کے رنگوں میں رنگ جاتا ہے۔ ابھی تاج اپنی دُودھیا چھب سے سورج کے سنہرے میں نہا گیا تھا، جیسے چاندی پر سونے کا پانی چڑھا ہوا۔ شاید اب یہ سورہ الشمس کا معجزہ تھا۔ والشمس والضحیٰ یعنی "قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی" اور یہاں یہ قسم مجسم ہو رہی تھی۔ پورا تاج سورج اور اس کی دھوپ میں جگمگا رہا تھا۔ ہمیں قصہ گوؤں اور فوٹو گرافروں نے گھیر رکھا تھا۔ تاج کا سیراب کھنچتا تھا۔ یہاں پھر دو روشوں کے درمیان بہتی شفاف پانی کی نہر تاج تک چلتی ہے، جس میں تاج کا عکس جھلملاتا ہے۔ آسمانی رنگ ٹائلز والے شفاف پانیوں میں تاج کا منظر، تسنیم و سلسبیل کی آغوش میں اُترتا ہوا تاج جیسے آئینے میں اپنا عکس دیکھتا ہوا اور خود ہی حیران ہوتا ہو۔ "اللہ رے میں" شاید یہ سورۃ الضحیٰ کی کرامت ہو، جس کی آخری آیت ہے۔ "وَامّا بنعمته ربك فحدث" اور جو نعمتیں ہیں تمہارے رب کی ان کو خوب بیان کرتے رہنا اور تاج محل ان نعمتوں کی مفصل تفسیر تھا۔ ان آیات کو کندہ کرنے کا کیا مقصد رہا ہوگا۔ شاید محبت کے اس تعویذ کی تاثیر بڑھانا مقصود ہو۔ شاید بارگاہِ محبت میں داخل ہونے کے آداب سکھانا ہوں شاید اس جنت ارضی سے جنتِ ساوی کی حقیقت سمجھانا ہو۔

تو ہم بڑھ رہے تھے تاج ہٹ رہا تھا، جیسے کوئی سراب، جیسے کوئی طلسمی محل، جیسے نظر کا دھوکا لیکن یہ حقیقت تھی۔ ناقابل یقین حقیقت کہ ہم تاج محل میں موجود تھے تاج سامنے تھا اور ہم اپنی ننگی آنکھوں سے اسے ٹک ٹک دیکھتے تھے۔ جوتے رکھوائے اور ننگے پیر اُس وسیع و عریض صحن میں داخل ہونے کو سیڑھیاں چڑھنے لگے جس کے چاروں کونوں میں تاج کے بیرونی مینار کھڑے ہیں۔ بیسوؤں فٹ اُونچا صحن لیکن یہاں پہنچنے کو مختصر کشادگی والے یہی زینے ہیں، کہا جاتا ہے روزانہ تقریباً تین ہزار سیاح یہاں آتے ہیں۔ سبھی کو جوتے اُتار کر انھی زینوں سے اُوپر جانا ہوتا ہے کہ یہ بارگاہِ محبت ہے کہیں سوئے ادب نہ ہو جائے۔ ستمبر کی دھوپ میں سفید ٹائلز تپ رہی تھیں۔ چند قدم چلنے سے پیر چھالوں سے بھر گئے۔ کاش ہمارے قدموں تلے سرخ قالین بچھے ہوتے۔ کسی ملک کے شہزادے شہزادیاں نہ سہی لیکن اس وقت تو سبھی خاص تھے کہ تقدیر نے اُنھیں تاج محل دیکھنے کے لائق بنا دیا تھا۔ جنت ارضی میں داخل ہونے کا اعزاز بخشا تھا۔ تاج محل کے شایانِ شان پروٹوکول ملنا چاہیے تھا۔ سفید بے داغ سنگ مرمر سے آراستہ وسیع و عریض صحن کے چاروں کناروں پر ایستادہ بلند و بالا میناروں کے درمیان ممتاز محل کا مقبرہ جس کا داخلی دروازہ کھلا تھا اور لوگ فاتحہ خوانی کے لیے داخل ہو رہے تھے۔ منتظمین یہاں زیادہ دیر کھڑا نہ رہنے دیتے تھے۔ دائیں ہاتھ سے چکر شروع کرو اور بائیں ہاتھ سے باہر نکل جاؤ۔ سنگ مرمر کی جالی کے اندر دو قبریں ممتاز محل اور شاہ جہاں، ایک بڑی ایک نسبتاً چھوٹی قبر۔ ممتاز محل کی قبر پر لکھے خدا کے ننانوے نام۔ جالی کے پیچھے چوگردشی کمرے ہر کمرے کے دروازے کے بالمقابل سیدھ میں پھر وہی سنگ مرمر کی نفیس

جالیاں۔ بالکل اسی طرح جیسے تاج کے بیرونی دروازے میں پورا تاج بھر آتا ہے۔ ان جالیوں سے باہر کا منظر ہویدا تھا اور سورج کی روشنی اندر چھن رہی تھی۔ چھت پر مختلف رنگوں کی نقاشی، ہلکے گہرے نیلے، بھورے، ہرے رنگ کاشی کاری، بیتا کاری، شیشہ گری کے نادر نمونے دیواروں پر آیاتِ قرآنی کی خطاطی کے علاوہ نجانے کس کس فن کی باریکیاں اور نفاستیں قبروں کے عین اُوپر گنبد نما چھت اس گنبد کے کئی بیضوی ٹکڑے جن کی سڈول گولائیاں دھیمے رنگوں کی نقاشی سے نمایاں تھیں۔ درمیان میں اُبھرے ہوئے مرکز کے ساتھ فانوس جھولتا تھا۔ شاید یہ بھی آثارِ قدیمہ کا حصہ ہو۔ ذرّہ ذرّہ آرٹ، نفاست و کاریگری، رنگ اور فن، چپہ چپہ آراستہ اور درمیان میں یہ پریمی جوڑا سوتا تھا۔ قبریں تو کہیں بہت نیچے تہ خانوں میں ہیں۔ نشانیاں اُوپر دھری ہیں۔ اس شاہی جوڑے کی محبت کی شاہانہ نشانی تاج محل، یہاں بھیڑ بہت تھی۔ چوگردشی کمروں میں داخل ہونے سے روکا جا رہا تھا۔ جلدی جلدی باہر نکالا جا رہا تھا۔ جنتِ ارضی کے ساکن تو گہری نیند سوتے تھے۔ اُنھیں یہ بھیڑ بھاڑ کہاں پسند ہوگی۔ ایک نے جلد ہی دُنیا سے منہ پھیر لیا اور دوسرا جو اس جنت کا معمار تھا وہ بیس برس ایک ہی نظارہ کرتا تھا۔ تاج محل کا نظارہ۔

باہر نکل کر تاج کے چاروں طرف چکر لگایا۔ چھونے کی ممانعت نہ تھی، یہاں اردگرد کوئی حفاظتی باڑ نہ لگائی گئی تھی۔ اُوپر نیچے سفید سنگِ مرمر کی قوسیں جن میں نفیس جالی ورک تھا۔ اُوپر وہ گنبد جس نے فنِ تعمیر کے ماہرین کو آج بھی ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے جس کے گرد آٹھ مینار کھڑے تھے۔ فن کاری کے ایسے نمونے کہ تاج محل کو عجائباتِ زمانہ میں لکھوا گئے۔ ہم تاج محل کی پچھلی طرف چلے گئے، جہاں جمنا کا کنارہ تھا اور دور پرے آگرہ فورٹ نظر پڑتا تھا۔ یہیں کسی قفس میں یہ پریمی بادشاہ قید رہا ہوگا جس کی ایک ہی خواہش تھی کہ اُسے ایسے زندان میں رکھا جائے جس کا روزن تاج محل کی سمت کھلا ہو۔ لال پتھر سے بنا آگرہ فورٹ اکبر کا تعمیر کردہ محل ہماری نظروں میں تھا۔ اتنا دور کہ بمشکل اُس کے خدوخال نمایاں ہو پاتے تھے۔ قیدی بادشاہ کو بھی کیا تاج یونہی دُھند میں لپٹا نظر آتا ہوگا لیکن نہیں تاج کی تو یہ عجب خوبی ہے کہ جتنا دُور ہٹو اتنا قریب، واضح اور بڑا ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر قیدی بادشاہ کی آنکھوں میں تو اس کا خواب جاگا تھا۔ وہ انجینئروں کے اُس گروہ کا سربراہ تھا جس نے تاج محل کو دُنیا کے نقشے پر عجوبہ بنایا وہ آنکھیں بند کرے یا کھولے تاج تو وہیں کہیں بستا ہوگا۔

بہت نیچے جمنا کنارہ، پانی اُتر چکا تھا۔ کبھی لبالب بھرا ہوتا ہوگا جس طرح تاج کے سامنے کا عکس تسنیم و سلسبیل میں جھلکتا تھا۔ بغلی منظر جمنا میں اُترتا ہوگا جہاں تاج محل کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے فنِ تعمیر کے انوکھے طریقے اپنائے گئے تھے۔ وہی جمنا جہاں سے کشتی پر رکھ کر تاج محل کے معمار کا جسد خاکی لایا گیا تھا کہ اپنی ہی بنائی ہوئی جنت میں دفن ہوا تھا۔ اگر اورنگ زیب اوتاولا نہ ہو جاتا تو تاج کے سفید سنگ مرمر کے بالمقابل سیاہ سنگ مرمر سے اسی طرز کا ایک اور محل تعمیر ہونا تھا جس کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ پھر خزانہ جواب دے گیا اور شاہ جہان کا اقتدار بھی اور زنداں خانے کا روزن بیس برس تک حلقۂ چشم بنا رہا۔ درمیان میں جمنا حائل جس میں تاج بھیگتا تھا۔ عجب اُداسی کے رنگ بکھر گئے تھے۔ تاج اُداس بھی ہو جاتا ہے۔ دن ڈھل رہا تھا تاج پر اُداسی کے ملگجے رنگ چڑھ رہے تھے۔ دائیں ہاتھ سرخ پتھر سے بنا میوزیم تھا جس میں مغلیہ عہد کی تاریخی اشیاء موجود تھیں جو کہیں بھی ہو سکتی تھیں۔ لال قلعہ دلّی، بادشاہی قلعہ لاہور اور کہیں بھی لیکن تاج کہیں اور نہیں ہو سکتا۔ برصغیر میں موجود تمام تاریخی عمارتوں کے ماتھے کا جھومر، مغلیہ آرکی ٹیکچر کا تاج، جس کی ایک ایک اینٹ سفید تابدار موتی سی جگمگاتی تھی۔ تاج اس تمام جزئیاتی حسن کو ایک مکمل معجزے کے اسرار میں سمو لیتا ہے۔ ہم واپس جا رہے تھے۔ تاج ہماری سمت بڑھ رہا تھا پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔ مڑ مڑ کر دیکھتے تاج ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔

شفاف روشوں پر سے گزرتا ہوا تاج، سلسبیل و تسنیم میں نہایا ہوا تاج، حوضِ کوثر سے اُبھرتا ہوا تاج، جس کی آرچوں کی براق جالیوں میں یادوں کے دیپ جلتے تھے۔ ہر ہر کٹ ورک میں جیسے نور کی پتلیاں رکھی ہوں جیسے آنکھوں کے پیالے وہیں حیرت سے کھلے رہ گئے ہوں۔ ہم چوبرجیوں والے عظیم الشان دروازے سے باہر نکل رہے تھے، جس کی تمام کشادگیوں اور رفعتوں میں تاج بھرا تھا جیسے کہتا ہو کس سمت سے بچ کے نکلو گے۔ آنکھ کے تل میں سماتا ہوا جہانِ حسن، دل کی کٹوری میں کھلتا ہوا سنگِ مرمر کا سفید کنول، مور پنکھ پہ دھرا محبتوں کا دیپ، قصہ گو کی صدا، حوضِ کوثر سے اُبھرتی تھی۔ آپ جب یہاں سے جائیں گے تو تاج کو ہمراہ لے جائیں گے۔

شاعری

چپ چاپ ہی سہتے ہیں دہائی نہیں دیتے
ہم ٹوٹ بھی جائیں تو سنائی نہیں دیتے
جب شعر سناتی ہوں تو پھر داد کی صورت
کچھ لوگ مجھے ”زخم دکھائی“ نہیں دیتے
تم مجھ سے میرے درد کی دولت کو نہ مانگو
مزدور تو محنت کی کمائی نہیں دیتے
تم چوڑیاں پہنانے کی خواہش کو بھی سمجھو
ہاتھوں میں ترے یوں ہی کلائی نہیں دیتے
ہم لوگ نہیں ہجر کے آزار کے قابل
ایسوں کو بہت روز جدائی نہیں دیتے
ناہید میں آنکھوں کو ابھی بند تو کر لوں
دیکھوں گی مجھے کیسے دکھائی نہیں دیتے

ڈاکٹر ناہید کیانی

تجھ کو ہو تو تجھے معلوم ہو کیا ہوتی ہے
شام کے وقت جو اس دل کو بلا ہوتی ہے
خود بھی مرجھاتے نہیں پیڑ لگانے والے
ایسے لوگوں کو پرندوں کی دعا ہوتی ہے
دیر تک ڈھونڈتی رہتی ہوں کہ کیا ٹوٹا ہے
جب کہ آواز تو کچھ ٹوٹے بنا ہوتی ہے
تجھ کو ہی راس نہیں آئی تو گالی مت دے
دیکھ اے دوست محبت بھی خدا ہوتی ہے
یہ ترے ہوتے جو تھوڑی سی پریشانی ہے
تو نہیں ہوتا تو پھر آٹھ گنا ہوتی ہے
اپنی تصویر کو سمجھاؤ کہ ایسا نہ کرے
یہ میرے ساتھ بہت دن سے خفا ہوتی ہے
طب سے وابستہ ہوں ناہید سو میں جانتی ہوں
اس اداسی کی دوا صرف دعا ہوتی ہے

ڈاکٹر ناہید کیانی

کافر مزاج لوگ تھے اور بندگی کو جی
کس عمدگی سے کرتے رہے خودسری کو جی
شاید ترے نگر سے کوئی ہو کے آیا ہو
ہم نے اسی قیاس پہ کی ہر کسی کو جی
پہلے بناتے وقت کیا عجلتوں کی نذر
پھر ہاتھ میں تھما کے کہا زندگی کو جی
گر سختیوں کے تجھ پہ معانی نہیں کھلے
رکھ حسرتوں کو جیب میں اور مفلسی کو جی
وہ رنجشوں کو طاق میں رکھ کر تھا آ گیا
ہم نے بھی سب بھلا کے کہا یار جی کو جی
تجھ کو جہیز دوں یا بچاؤں میں بھوک سے
یا پھر کہوں کہ بیٹی مری بے بسی کو جی
ہم تک صدائیں اور بھی آتی رہیں مگر
ہم نے ہر ایک بار کہا آپ ہی کو جی

مقدس ملک

اک شخص میرے ساتھ میں رہتا ضرور تھا
لیکن فقط تھا ظاہری باطن میں دور تھا
ایسا نہیں کہ مجھ سے اسے عشق ہی نہ تھا
تھا جو سبب فراق کا اس کا غرور تھا
دل چیختا تھا درد سے پھر بھی وہ ہنستا تھا
واللہ اس کو ہجر کا کتنا شعور تھا
پھر اس کے بعد زندگی روتے ہوئے کٹی
عزت رکھی تھی قوم کی اتنا قصور تھا
اک دوست میرا زویا منافق مزاج تھا
ملتا تھا ہنس کے مجھ سے دل میں فتور تھا

زویا شیخ

ترے خیال سے نکلیں تو داستاں ہو جائیں
نصیب ہو جو ترا ساتھ، جاوداں ہو جائیں
ہماری راکھ اُڑانے کو آئے گا وہ شخص
سو اس سے پہلے بھلا کیسے ہم دھواں ہو جائیں؟
تمہارے ملنے تلک قادر الکلام رہیں
تمہارے سامنے آئیں تو بے زباں ہو جائیں
ہمارا مسئلہ، دیکھو ہمارا مسئلہ ہے
یہ لوگ کس لیے اب اپنے درمیاں ہو جائیں
دلیل ہے ترے ہونے کی یہ ہمارا وجود
ترا نشاں بھی نہ ہو، ہم جو بے نشاں ہو جائیں
یقین ہے تمہیں اس وقت ہوش آئے گا
تمہاری چاہ میں جب یوں ہی رائیگاں ہو جائیں
گماں ہمارا ہمیں راس ہی نہیں آتا
سو جی یہ چاہے کہ پھر تم سے بدگماں ہو جائیں
ہماری فکر میں نیندیں حرام ہوں اس کی
ہم اس کے واسطے اے کاش امتحاں ہو جائیں
وہ دور جائے تو لے جائے ہر خوشی میری
قریب آئے تو سب غم یہاں وہاں ہو جائیں
ہمارا ہاتھ ذرا آپ تھام کر رکھیے
کہیں حضور نہ ہم گردِ کارواں ہو جائیں
ہمیں یہاں سے اُٹھائے، اُٹھیں یہاں سے ہم
جہاں جہاں وہ کہے ہم وہاں وہاں ہو جائیں
رباب جان بھی حاضر ہے اک اشارے پہ
وہ ہم کو درد بھی دے دے تو شاد ماں ہو جائیں

فوزیہ رباب

انٹرویو.....فرحت پروین

ارژنگ: سب سے پہلے اپنے سوانحی وادبی پس منظر سے آگاہی دیجیے؟

فرحت پروین: بات تو تھوڑی عجیب ہے مگر مجھے کبھی بھی آباؤاجداد کے دولت وثروت کے قصوں سے دلچسپی نہیں رہی۔ ابا جی کبھی ذکر کرتے تو میں منہ چڑھی تو تھی ہی۔ صاف کہہ دیتی ''ابا جی مجھے پدرم سلطان بود سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' اب سوچتی ہوں تو دکھ ہوتا ہے کہ یہ تو گستاخی اور دل شکنی تھی۔ نوعمری میں اپنی شخصیت کا کچھ زیادہ ہی احساس ہوتا ہے۔ طارق بٹ نے کیا خوب کہا ہے:

اپنے ماضی کا کوئی نقش سنبھالے رکھتا
کون تھے کیا تھے بتانا کہیں پڑ جاتا ہے

سو اسے چند لائنوں میں سمیٹنے کی کوشش کروں گی۔ میرے اپنے خیال کے مطابق اگر کسی قلمکار کے سوانحی پس منظر میں شعروادب کی کوئی وراثت نہیں تو وہ اتنا اہم نہیں۔ مگر آپ کا کہنا ہے کہ قارئین کو اس میں دلچسپی ہوتی ہے۔ سو میرے آباؤ اجداد سرائے نو رنگ ضلع بنوں سے تعلق رکھتے تھے۔ گھر میں بول چال کی زبان پشتو تھی۔ ہمارے پردادا خان بہادر سلطان محمود خان رئیس اور جاگیردار تھے جن کی حویلی پر سواری کے لیے گھوڑوں کے علاوہ ہاتھی بھی جھومتے تھے۔

پھر ہمارے دادا خدا بخش خان اپنے دور پار کے رشتہ داروں کو ملنے بھکر آئے جو اُس وقت ایک پسماندہ قصبہ تھا۔ یہاں ایک چھوٹی ذات کی لڑکی کے حُسن کی چکاچوند نے دیوانہ کر دیا جانتے تھے نہ والد سے اجازت ملے گی اور نہ منگیتر کے خاندان والے زندہ چھوڑیں گے۔ سو اس سے شادی رچا کر بھکر میں ہی مستقل اقامت پذیر ہو گئے کہ واپسی کے راستے انہوں نے خود ہی بند کر دیے تھے۔ پولیس میں ملازمت کر لی۔ تھانیدار ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھکر سے پہلی ٹرانسپورٹ کمپنی کی داغ بیل ڈالی۔ ''خان ٹرانسپورٹ کے نام سے'' دادا کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ابا جی سب سے چھوٹے تھے۔ یوں تو میں نے ابا جی کو علاوہ ڈائری لکھنے کے کچھ خاص لکھتے نہیں دیکھا۔ مگر کسی بچے کی پیدائش، سالگرہ اور شادی کے موقعے پر منظوم مبارک باد لکھتے تھے۔ گلا بھی خوب پایا تھا جب ترنم سے پڑھتے تو رنگ جما دیتے۔ ایک دو موقعوں پر ترنم سے ایک دو غزلیں بھی سنائیں خدا جانے ان کی اپنی تھیں یا کسی کی۔

ننھیال کا گھرانا بہت پڑھا لکھا اور معزز تھا۔ پاس پڑوس کی بچیاں نانی سے قرآن پاک پڑھنے آتیں۔ دونوں ٹائم بہت بڑا سکول لگتا۔ یہ لوگ ترقی یافتہ ذہن رکھتے تھے۔ ان میں ڈاکٹر اور سرجن بھی تھے۔ خود میرے نانا بہت مشہور دندان ساز تھے۔ خواتین بھی پڑھی لکھی تھیں۔ بھکر میں لڑکیوں کا پہلا سکول میرے نانا نے اپنے گھر کے ایک حصے میں بنایا تھا جس میں ان کی گھر کی خواتین باضابطہ سکول چلاتی تھیں۔ گھر کی فضا مکمل دینی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اُستاد خانہ تھا پورے قصبے میں بہت عزت تھی۔ نانی تو گویا وہاں کی جج تھیں۔ سارے جھگڑے ان کے گھر چکتے تھے اور کوئی ان کے فیصلوں سے انحراف نہیں کرتا تھا۔ ان سب مشاغل کے علاوہ میں نے کسی کو شعروادب کی کتابیں پڑھتے نہیں دیکھا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ توبۃ النصوح، قصہ چہار درویش، باغ و بہار، قصہ گل بکاؤلی، داستان امیر حمزہ اور گل بہ صنوبر چہ کرد جیسی کتابیں نانی کی قرآن شریف والی الماری سے ملیں۔ کوئی تو پڑھتا ہوگا۔ کبھی۔

سوال: ادب سے شوق کی ابتدا؟

فرحت پروین: یہ تو طے ہے کہ مجھے ادب سے لگاؤ ماحول یا وراثت سے نہیں ملا۔ یہ تو قسامِ ازل نے یوم الست ہی میرے خمیر میں گوندھ دیا تھا۔ میرا بچپن تو لاہور ہی میں گزرا۔ پھر بوجوہ جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی، ہم بھکر منتقل ہو گئے۔ جس کا خسارہ سب سے زیادہ مجھے ہوا کہ مجھے میری طلب اور پیاس کی نسبت بہت کم کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں۔ سو میں نے اچھا برا جو ملا کچھ نہ چھوڑا۔ سکول کی لائبریری میں کتابیں بہت زیادہ نہیں تھیں۔ چھوٹا اور پسماندہ شہر تھا شاید اس لیے۔ پہلے تو لائبریرین مجھے کتابیں دینے پر راضی نہ تھی لیکن جب میں پڑھ کر جلدی جلدی لوٹانے لگی تو پھر وہ دینے لگ گئی۔ سچ پوچھیں تو مجھے کورس کی کتابوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر ذہن اچھا تھا۔ کلاس میں پوری توجہ سے ٹیچر کا پڑھایا ہوا سُن اور سمجھ لیتی۔ یہی میرے لیے کافی ہو جاتا۔ ہوم ورک کبھی نہیں کرتی تھی کہ وہ وقت مجھے غیر نصابی کتابیں پڑھنے کے لیے درکار ہوتا تھا۔ سو سارا سال ٹیچر کی ڈانٹ چکنے گھڑے کی طرح سُن لیتی۔ مگر ہمیشہ فرسٹ آتی۔ جتنا بھی پڑھا اعزاز کے ساتھ پانچویں

کلاس سے وظیفہ ملا اور بی اے تک یہ سلسلہ بغیر کسی لمبی چوڑی مشقت کے چلتا رہا۔ ہاں ایم اے میں یہ اعزاز قائم نہ رکھ پائی کہ اب زندگی میں بہت مسائل تھے۔ گھر بار، بال بچے وغیرہ تو بات ہو رہی تھی میرے ادب کے شوق کی ابتدا کی۔ تو جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ یہ میری مٹی میں گندھا ہوا تھا۔ مطالعے نے اسے صیقل کیا اور کتابیں میری زندگی کی ساتھی بن گئیں۔ البتہ مجھے کبھی کچھ لکھنے کی تحریک محسوس نہ ہوئی۔ ہاں کلاس میں میرے مضامین سب سے اچھے ہوتے تھے۔ سکول کے فنکشنز میں ایک دو مزاحیہ قوالیاں بھی لکھیں۔ شہر سے باہر ڈیبیٹ پر جانے والی لڑکیوں کو تقاریر ہمیشہ میں لکھ کر دیتی تھی۔ ایک دو بار ٹیچرز پر بھی مرزا رفیع سودا کی طرز پر نظمیں بھی کہیں اور اپنی کلاس کو سنا کر داد پائی۔

خود میں بہت شرمیلی تھی۔ سو نہ مباحثوں میں حصہ لیا اور نہ ڈراموں میں جس پر کئی بار ٹیچرز کی شدید ناراضگی اور سزا بھی برداشت کی۔ مگر اپنے خول سے باہر نہ آئی۔

پڑھنے کا مجھے بے انتہا شوق ہے۔ اب جبکہ میں کئی کتابوں کی مصنفہ ہوں اگر مجھ سے کہا جائے کہ پڑھنے اور لکھنے میں سے ایک چیز چن لو تو میں ایک سیکنڈ بھی سوچے بغیر مطالعہ چنوں گی۔

میری اپنی ایک دنیا ہے جس کے آفاق بہت وسیع ہیں۔

تھوڑے سے دیوانے ہیں ہم، لوگ بھی سچ ہی کہتے ہیں
دل میں ہمارے اک دنیا ہے جس کے اندر رہتے ہیں

تو کم لفظوں میں اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ میں ایک خود رو پودا ہوں جس کی آبیاری قدرت کرتی رہی اور یہ پودا بڑھتا پھیلتا رہا اور جب یہ پودا گھنگھنا کر خوب پھل پھول گیا تو ایک صاحب نظر باغبان کی اس پر نظر پڑی۔ اُس نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ یہ صاحب نظر پارکھ باغبان احمد ندیم قاسمی تھے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے۔

اردو کی محبت تو میرے خون میں گردش کرتی تھی۔ امریکہ کے دوران قیام اپنے بچوں کی وجہ سے کالجوں یونیورسٹیوں سے رابطہ رہتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا کہ نئی نسل کے لوگ صرف انگلش بولتے تھے۔ گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی۔ لگتا تھا کہ وہ اردو کو اور اپنی مادری زبانوں کو بھی مکمل طور پر بھلا دیں گے۔ مجھے بہت دکھ ہوتا تھا اور پھر میں نے صرف افسوس کرنے کے بجائے عملی طور پر کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ میں اب کوئی شرمیلی لڑکی نہیں چار بچوں کی ماں تھی۔ کتابوں کی سنگت نے مجھے اعتماد کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ میں نے طالب علموں کو ترغیب دلانے کے لیے ابتدا یونیورسٹی میں ورائٹی پروگراموں سے کی جو اردو میں ہوتے تھے اور پھر ''فیض نائٹ'' جیسا دھانسو پروگرام کیا کہ امریکن پروفیسروں نے بھی شرکت کی اور ہماری شاعری سے متعارف ہو کر بڑی حیرت سے یہ الفاظ کہے کہ ہمیں ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ تمہارے ملک تمہاری زبان میں بھی اس معیار کی شاعری موجود ہے اور پھر یہ پروگرام یو۔ این کے کلچرل پروگرام کے لیے منتخب کیا گیا۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ امریکن پروفیسروں کو اتنی اچھی طرح اُردو شاعری کیسے سمجھ میں آ گئی تو میں بتاتی چلوں کہ ہم نے ان نظموں کا انتخاب کیا جن کے انگلش تراجم موجود تھے۔ ایک پاکستانی لڑکا اُردو میں نظم پڑھتا تھا پھر سپاٹ لائٹ سٹیج پر پہلے سے موجود امریکن لڑکے پر چلی جاتی اور وہ اسی نظم کی انگلش ٹرانسلیشن پڑھ دیتا۔ شاعری پڑھنے والے سب لڑکے لڑکیوں کو شلوار قمیصیں میں نے مہیا کی تھیں۔ اتنے پیارے لگ رہے تھے کہ کیا بتاؤں۔ پھر اسی طرح مشاعرے بھی ہوئے اور آخرکار میں نے اُردو سوسائٹی بنانے کی ٹھان لی۔ اس کی پہلی میٹنگ اپنے گھر رکھی۔ اچھے اچھے کھانوں کا لالچ دے کر کہا کہ کچھ لکھ کر بھی لانا۔ کچھ بھی جیسے آج کیا کیا؟ تاکہ وہ لکھنا بھی نہ بھولیں۔ لاڈلے منہ چڑھے بچے تھے۔ بولے ''آپ بھی لکھ رکھئے گا آنٹی''

اُس وقت تک میں مصنفہ نہیں تھی۔

خیر وہ آئے کھانا بھی ہوا۔ میٹنگ بھی.....

سب نے اپنا اپنا لکھا سنایا۔ اب باری میری تھی۔ میں گھر کے کاموں میں مصروف ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں لکھ سکی تھی۔ ان کو ترغیب دلانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ وہ بضد تھے کہ میں اپنا لکھا سناؤں اور پھر میں نے ایک کاپی اُٹھا کر اُسے کھول کر زبانی ہی وہ واقعہ سنا دیا جو دو دن پہلے میرے گھر پر ہوا تھا۔ بچوں نے ایئر گن سے ایک ''سکنک'' کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ سکنک مرا تو نہیں بھاگ گیا مگر ایسی ناقابل بیان یادداشت چھوڑ گیا کہ بیان سے باہر ہے۔ دوسرے دن میں نے اس واقعے کو لکھ لیا۔ جب اُسے پڑھا تو لگا کہ اس تحریر میں جہان ہے۔ پاکستان فون کر کے پوچھا کہ پاکستان میں سب سے اچھا ادبی پرچہ کون سا ہے؟ تو جواب ملا ''فنون'' جسے احمد ندیم قاسمی نکالتے ہیں۔ مگر وہ صرف اے کلاس رائٹر کو چھاپتے ہیں۔''

لاکھ لاپروائی ہو مگر کچھ نہ کچھ خود آگہی تو ہوتی ہے۔ میں نے جواب دیا ''میں نے صرف پرچے کا نام پوچھا ہے وہ کون سی کلاس کو چھاپتے ہیں یہ نہیں پوچھا اور فون بند کر دیا۔ پھر میں نے اپنی وہی پہلی تحریر احمد ندیم قاسمی کو بھیج دی۔ چار لائنوں کے نوٹ کے ساتھ کہ ''میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا مجھ میں لکھنے کی صلاحیت ہے یا میں اپنا وقت ضائع نہ کروں۔''

جواب میں ان کا چار صفحے کا خط آیا۔ جس میں انہوں نے بہت تعریفوں کے بعد لکھا کہ یہ افسانہ تو عالمی مقابلے میں رکھنے کے قابل ہے۔

جب میں پاکستان پہنچی تو میرا پہلا افسانہ ''سسکنک'' کے نام سے فنون کی زینت بن چکا تھا اور جناب احمد ندیم قاسمی ''ادب دوست'' میں میرے فن کی تعریف میں مضمون بھی لکھ چکے تھے۔ اگر وہ صاحب نظر سچا پارکھ میری حقیر کاوش کو وقار نہ بخشتا تو آج میں افسانہ نگار نہ ہوتی۔ میری زندگی کے ہر لمحے پر ان کا قرض ہے۔

گرینڈ انٹری کا تو ذکر ہو گیا۔ اب تصانیف کا بتا دوں۔

اب تک میری جو کتابیں آ چکی ہیں۔ ان میں پانچ افسانوں کی ہیں۔ کیونکہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہوں۔ (۱) منجمد (۲) ریستوران کی کھڑکی سے (۳) کانچ کی چٹان (۴) صندل کا جنگل (۵) بزم شیشہ گراں (۶) (عالمی ادب سے کلاسیکس کے تراجم) خواب کوہستاں اور ایک امریکن مصنفہ کا ناول سائنس فکشن (۷) دی گور (۸) (نظموں کا ایک مجموعہ) گفتم۔ کل آٹھ کتابیں ہیں۔

اور ایک طویل تاخیر کے بعد اب ایک ساتھ تین کتابیں آ رہی ہیں۔ ان میں ایک غزلوں کا مجموعہ۔ ایک افسانوں کا اور ایک فری تھائس کا۔

سوال: آپ نثر نگار بھی ہیں شاعرہ بھی۔ شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نہیں؟

فرحت پروین: میرے خیال میں شاعری اظہار کا سب سے خوبصورت ذریعہ ہے۔ شاعر ایک شعر میں جو بات کہہ جاتا ہے۔ نثر میں اُس کے لیے کئی صفحات درکار ہوں گے۔ اختصار کا یہ حسن اُس کی تاثیر اور معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔

جہاں تک میرا معاملہ ہے وہ یہ ہے کہ افسانہ میں لکھتی ہوں اور شاعری مجھ سے سرزد ہو جاتی ہے۔ اکثر دفعتاً آن وارد ہوتی ہے۔ غالباً لاشعور میں بھٹکتے خیالات صورت پذیر ہو کر قلم کی نوک پر آ جاتے ہیں۔

ویسے تو افسانوں کا بھی یہی قصہ ہے۔ میرا کہنا ہے کہ کہانیاں میں نہیں لکھتی۔ کہانیاں خود کو مجھ سے لکھواتی ہیں۔ وہ اپنا اسلوب لفظیات اور موضوع سب کچھ خود لے کر آتی ہیں اور سامنے بیٹھ کر لکھوا لیتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ میرے قلم تک پہنچنے سے پہلے میرے ذہن میں شعور، لاشعور اور خارجی واقعات کے ساتھ مل کر کئی کئی دن تک محفلیں سجاتی اور صلاح مشورے کرتی رہتی ہیں اور جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ڈھیروں ڈھیر رنگ برنگی کہانیوں کے گرد مڑھا ہوا خول ہوں اور اگر میرے اندر سے ساری کہانیاں نکال لی جائیں تو میں Piniyata پنیاٹا کی طرح صرف ایک کھڑکھڑاتا خول رہ جاؤں گی۔

پڑھنے کا مجھے ہوکا ہے۔ امریکہ کے مستقل قیام کے دنوں میں ساتھ لے کر گئی ہوئی کتابیں کم پڑ جاتیں تو میں نے انگلش لٹریچر پڑھنا شروع کر دیا۔ یوں تو وہ جرمن فرنچ اور دوسری زبانوں کا ہوتا تھا مگر میں ان سب کی انگلش ٹرانسلیشن ہی پڑھتی تھی۔ کچھ کہانیاں مجھے بے انتہا پسند آئیں تو میں نے ان کا اردو ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ میرا دل چاہتا تھا کہ یہ نفیس ادب پاکستان میں بھی لوگ پڑھیں۔ ان کلاسیکس شارٹ سٹوریز کے تراجم ''خوب زمستان'' کے نام سے چھپے اور ایک امریکن رائٹر کا سائنس فکشن بھی ترجمہ کیا۔

اور اب میں اردو ادب میں ایک نئی صنف کو متعارف کرانے والی ہوں۔ پچیس برس پہلے کے ڈیپریشن کی کیفیت میں لکھے ہوئے ان فری تھائس یا خیال کی آزاد رو کو میں نے چھپوانے کا فیصلہ کیا ہے۔ سوچا اتنی ساری کاپیاں بھری پڑی ہیں کچھ غزلیں بھی منتخب کر کے چھپوالوں اور نظموں کا مجموعہ تو آ ہی چکا ہے۔

سوال: الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟

فرحت پروین: بے شک الیکٹرانک میڈیا پر بھی بہت کچھ جاننے اور پڑھنے کو مل جاتا ہے اور یہ ایک اضافی سہولت ہے۔ مگر مجھے اس سے اختلاف ہے کہ اس کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک جہاں الیکٹرانک میڈیا اپنے عروج پر ہے وہاں کتابوں سے وابستگی کا یہ عالم ہے کہ ایئرپورٹ لاؤنج میں لوکل ٹرین میں اکثر لوگوں کے ہاتھوں میں کتابیں ہوتی ہیں۔ طویل سفروں میں تو اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھ رہے ہوتے

ہیں۔ چھپے ہوئے لفظ کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے۔ فرعونوں کے زمانے کا ایک درخت کے تنے پر لکھا ہوا قول ہے جو زبانیں ڈی کوڈ ہونے کے بعد پڑھا گیا اور جو آج تک موجود ہے۔ جس پر لکھا ہوا ہے کہ ''اگر آپ کسی درخت کے نیچے بیٹھے ہیں اور آپ پر سایہ نہیں ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ وقت اب آپ کا نہیں رہا۔ ابھی ہم الیکٹرانک میڈیا کے عبوری دور میں ہیں سو زیادہ متاثر اور مشتاق ہیں۔ جب اس کے عادی ہو جائیں گے تو کتاب کی قدر و قیمت کے پھر سے قائل ہو جائیں گے۔

سوال: تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

جواب: تخلیق ایک الوہی صفت ہے اور خالق کائنات اپنی عنایت خاص سے کچھ لوگوں کو اس صفت سے متصف کر دیتا ہے۔ ایک پڑھا لکھا شخص عالم ہو سکتا ہے۔ کالم نگار اور صحافی ہو سکتا ہے مگر تخلیق کار نہیں مصنف نہیں۔

ایک اچھا تخلیق کار وہ ہوتا ہے جو اپنے اندر کی تحریک کے ساتھ مطالعہ اور مشاہدہ بھی شامل کرتا ہے۔ وہ اس مطالعے، مشاہدے اور تجربے میں سے اُس چیز کا انتخاب کرتا ہے وہ اُس کے نقطہ نظر سے مماثل ہوں۔ ایک ہی واقعہ اگر ایک صحافی، ایک کالم نگار اور ایک مصنف دیکھ رہے ہوں تو تینوں اپنے اپنے انداز اور اپنی فکر کے مطابق قلمبند کریں گے جو ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔

تخلیقیت کی صفت مصنف کو ان سب سے ممتاز کرتی ہے۔ اب یہاں ایک اور بات بھی ہے کہ اس الوہی صفت کو کون کتنا صیقل کرتا ہے۔ کون اسے مطالعے سے وقیع بناتا ہے، کون اپنے زاویۂ نگاہ کو اس طرح احاطہ تحریر میں لانے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ اُس کی بات نہ صرف لوگوں کے دلوں میں اُتر جائے بلکہ فکر کے نئے باب بھی وا کرے اور اس کی تو کوئی حد ہی نہیں۔

سوال: کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

فرحت پروین: الاسکا کے کروز میں جب ہم گلیشیئر کے اوپر ہیلی کاپٹر کے ذریعے اُترے۔ وہ ایک طلسماتی لمحہ تھا۔ جب میں اپنے وجود سے نکل کر فضا کے تحیر میں گم تھی۔ تلووں میں کیل لگے بھاری بوٹوں کو دھیرے دھیرے قدم جما کر چلتے ہوئے اپنے بدن کے اندر میں نہیں تھی نیلا آسمان، ہلکی نیلی برف اور فضا میں تیرتا ہوا ایک اسرار ایک جادو۔ لگتا تھا مادی زندگی مادی دنیا کا تعلق کسی اور جہان سے ہے۔ بس ایک سکون کا احساس تھا۔ سرگوشیاں کرتی خاموشی تھی جو میری روح سے ہم کلام تھی۔ کیا راز بے پایاں راز و نیاز ہوئے ان کے درمیان، گرم کپڑوں میں لپٹا بھاری بوٹ پہنے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا میرا مادی وجود اس سے بالکل بے خبر تھا۔ کب اور کس طرح میں واپس ہیلی کاپٹر کے اندر پہنچی۔ کب لینڈ کیا کچھ احساس نہیں۔ جب مجھ سے جوتے واپس کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو میں اس دنیا میں واپس لوٹ آئی۔ ایک دکھ سا تھا کہ پھر وہی دنیا!!

میرے خیال میں یہ آسودہ ترین وقت تھا۔ دونوں سطحوں پر تھا۔ تخلیقی بھی اور زندگی کی بھی۔

سوال: مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

فرحت پروین: اگرچہ یہ ایک متنازعہ سوال ہے مگر میں اس کا جواب دوں گی۔ اس میں تو زیادہ سوچنے والی بات ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے آرگنائزرز جو یہ محفلیں برپا کرتے ہیں تو شرکا کو اکثر ان کے ادبی یعنی شعری قد کاٹھ کے مطابق مدعو کرنے کے بجائے ذاتی پسند ناپسند اور سفارشوں کی بنا پر ہوتا ہے۔ کیونکہ بالمشافہ پبلک کے سامنے آنے اور شہرت پانے کا سب سے موثر طریقہ ہے۔ سو معیار تو وہ نہیں رہتا جو کہ شعر و سخن کی تہذیب لیے ہو۔ اگر اس پر توجہ دی جائے تو معیاری مشاعرے ہو سکتے ہیں اور خوب سے خوب تر کہنے کی تحریک ہو سکتی ہے۔

سوال: کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے۔ معاشرے سے یا اندرون سے؟

فرحت پروین: معاشرے اور اندرون دونوں سے۔ جیسے دائیں اور بائیں ہاتھ کی مشترکہ حرکت سے کوئی فعل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ بالکل ویسے ہی معاشرے کی ابتری یا بہتری کی وجہ سے جو حالات و واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ تخلیق کار کے باطن کو تحریک دیتے ہیں۔ عموماً معاشی ناہمواریاں، ناانصافیاں، ظلم و جبر، مظلوم و مقہور طبقے کی تکالیف و مصیبتیں تخلیق کار کے حساس دل کو بے چین کر دیتی ہیں اور اُس کا قلم یہ سب کچھ سامنے لانے اور مراعات یافتہ طبقے کو آئینہ دکھانے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔

اصلی، حقیقی تخلیق کار حساس، نرم دل اور حق کا حمایتی ہوتا ہے۔ اور دنیا میں جو تبدیلی اُس کے امکان میں ہوتی ہے لانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کے لیے اس کا سب سے موثر ہتھیار اُس کا قلم ہوتا ہے۔

سوال: آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے

کردار کو کیسے دیکھتی ہیں؟

فرحت پروین: اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ سوشل میڈیا والے اچھی بری ہر چیز کو شائع اور مشتہر کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ نہ محقق اور نہ نقاد اور ہر وہ شخص جس کی کوئی چیز ایک دو بار سوشل میڈیا پر آ جاتی ہے خود کو بڑا قلمکار سمجھنے لگ جاتا ہے اور کچھ مزید سیکھنے اور محنت کرنے کی کوشش ترک کر دیتا ہے۔

سوال: ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

فرحت پروین: دیکھا جائے تو بنیاد تو ذاتی تجربات اور مشاہدات ہی ہوتے ہیں۔ جو اس کے قلم کو رواں رکھتے ہیں۔ ایک خاص انداز، سوچ اور زاویہ عطا کرتے ہیں۔ اُس کے ذہن کو وسعت عطا کرتے ہیں۔ خوشی اور غم کو زندگی کے دوزخ میں ہی۔ مگر دوسروں کے دکھ کو اپنا سمجھنے کا سلیقہ تب ہی عطا ہوتا ہے جب کوئی خود اُس میں گزرتا ہے۔ وہی اس کی تپش کو جان سکتا ہے جو اس آگ میں جل چکا ہو۔

سوال: کیا کھویا، کیا پایا؟

فرحت پروین: آپ کو حیرت تو ضرور ہوگی جب میں یہ کہوں گی کہ میں نے کچھ نہیں کھویا صرف پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سوز و گداز کی دولت عطا کرنے اور احساس کے نفیس جذبے سے اپنی تخلیق کا مقصد جاننے کا اعزاز بخشا ہے تو یہ پانا ہی ہے نا۔

دولت درد پا کے میں خوش ہوں گداز دل ملا
ایسا کبھی نہ آئے دن آنکھ مری نہ نم رہے

جیسا جاوید اختر نے کہا ہے:

غم ہوتے ہیں جہاں ذہانت ہوتی ہے
دنیا میں ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے

سو:

اپنی نظروں میں بھی ہم کچھ معتبر تب سے ہوئے
غم کی خلعت جب ملی اور درد سر بایا ہوا۔

نثری نظمیں/لبنیٰ صفدر، لاہور

اُمید

ہوائیں موافق رُخ اختیار کر رہی ہیں
میں اک نادیدہ خواب کے
منظر نامے میں
یاقوت سے بھرے ہوئے
کچھ درخت دیکھ سکتی ہوں
سُن ہوتی اُنگلیوں میں
اچانک ایک برقی رو دوڑ گئی
اور پھر میں نے
ان خوابوں کو چھو کر بھی دیکھ لیا
سچ اور محبت کے
کئی خوش نما رنگ
ان کے چہروں پر نمودار ہوئے ہیں
میں آج سے ہی
یقین کے تمام کاسنی پھول
اپنی ہتھیلیوں پر جمع کروں گی

ہجر زدہ

وہ کھڑکی آج بھی
اپنے مسافروں کی راہ تکتے تکتے
گہری اونگھ تو لے لیتی ہیں
مگر تھک کر کبھی اُس کو
میں نے سوتے نہیں دیکھا
دروازے کی انتظار سے اٹی
اور گرد سے بھری آنکھیں
تمام زردیاں اور تمام اُداسیاں
اپنے دکھ بھرے سینے میں لیے
زنگ آلود تالے میں اُتار دیتی ہیں
شاید کئی صدیاں گزر گئیں
اُداس بیلوں سے گلے لگ کر روتی ہوئی
دیواروں کو
چنبیلی سے مہکتی ہوئی پوریں
طلاق دے کر رُخصت ہو چکی ہیں
اک فسانہ سا لگتا ہے
کہ یہاں پر کسی نامعلوم زمانے میں
کچھ دل بھی دھڑکا کرتے تھے
کچھ زرد کچھ نیلے پتوں کی صورت میں
کچھ کہانیاں ابھی بھی
پیلی پگڈنڈی پر بکھری ہوئی ہیں
بدبودار، تعفن زدہ
تالاب پر جمی ہوئی
بے رُخی کی کائی بتا رہی ہے
ہجر ہو کہ انتظار
منظروں کے جسموں کو بھی
چاٹ جاتا ہے

انٹرویو.....سیما غزل

ارژنگ: اپنا نام اور خاندانی پس منظر بتایئے۔

سیما غزل: مجھے سیما غزل کہتے ہیں۔ خاندان ادبی تھا اس لیے وہ رنگ مجھ میں بھی موجود تھا۔ والد ریڈیو پاکستان میں اسکرپٹ رائٹر تھے۔ شاعر تھے اور جگر مرادآبادی کے ہم عصر اور دوست تھے۔ یہ بدقسمتی ہے ہماری کہ ان کا مجموعہ نہیں چھاپ سکے اور ان کی کتابیں، اسکرپٹ اور غزلیں جو بڑی احتیاط سے رکھوائی تھیں بارش میں ضائع ہو گئیں۔ ایک ڈائری چھوٹا بھائی لے گیا اور پھر جانے اس نے کہاں کی۔ بڑی بہن حجاب عباسی معروف شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں۔ بڑے بھائی بھی ٹی وی پلے رائٹر تھے۔ امی شاعرانہ ذوق رکھتی تھیں اور تھوڑی بہت شاعری کر بھی لیتی تھیں۔

یہ سارا ماحول ایسا تھا کہ ہم چاہتے بھی تو اس ماحول سے نکل نہ سکے۔ کیونکہ مشاعروں میں پاپا کے ساتھ جاتے جو نشستیں گھر پر ہوتیں وہ سنتے، بڑے بڑے لوگوں کو پاپا کے پاس آتے دیکھتے۔ ان کی باتیں سنتے۔ شاید اسی وجہ سے میرے خاندان میں جتنے لوگ بھی ہیں وہ کریٹو تھے۔ میرا بیٹا سید علی رضا (اسامہ) ڈائریکٹر رہا ہے جیو کا۔ جہاں اس نے بڑی بڑی سیریلز بنائی ہیں۔ "کاش میں تیری بیٹی نہ ہوتی" یہ پلے بہت اچھا تھا۔ لوگوں نے اسے بہت پسند کیا تھا۔

میرے لکھنے کی شروعات تو شاید 14 یا 15 سال کی عمر میں ہوئی مگر شاعری بہت پہلے شروع کر دی۔

مجھے جو اپنا پہلا شعر یاد آ رہا ہے وہ 14 برس کی عمر میں کچھ اس طرح اندازہ ہوگا۔ میرا پہلا شعر حاضر ہے۔

قبل آغاز کے انجام کا ڈر ہوتا ہے
دور اندیش بڑا تنگ نظر ہوتا ہے

مگر باجی نے ایک قصہ سنایا جو مجھے یاد نہیں تھا مگر باجی کے سنانے پر یاد آ گیا۔ میری پہلی کتاب "میں سائے خود بناتی ہوں" کی رونمائی کی تقریب تھی جہاں انہوں نے بتایا کہ یہ تمہارا پہلا شعر ہے۔ تم نے پہلا شعر چھ یا سال سال کی عمر میں کہا تھا۔ یہ سن کر میں حیران ہو گئی اور پھر..... یاد آ گیا۔

ہوا یہ تھا کہ شام کو تختی لکھا کرتی تھی کیونکہ رات کو پاپا سب کی تختیاں دیکھا کرتے تھے۔ میری تختی پر بال آ گیا تھا اور میں نئی تختی چاہتی تھی۔ امی کو دے دی، وہ کچن میں گئیں اور مجھے ڈانٹ دیا کہ ابھی اسی تختی پر لکھو۔ مگر میں روتی ہوئی آنگن میں بنے چبوترے پر جا بیٹھی اور زور زور سے رونے لگی۔ امی نے کئی بار ڈانٹا پھر تختی میری طرف پھینکی۔ مجھے چوٹ لگی اور تختی ٹوٹ گئی۔ عین اسی وقت باجی کمرے سے باہر آئیں۔ پوچھا کیا ہوا..... کیوں رو رہی ہو۔ تو میں نے کہا:

تختی بنی، بن کر ٹوٹی
امی نے ہمیں مار دیا

تو قارئین لکھنے کے جراثیم شروع سے تھے مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ میں نثر کی طرف دھیان دینے لگی۔ افسانے، ناول اور پھر ۱۹۹۸ء میں ٹی وی کے لیے ڈرامے لکھنے لگی اور لکھتی چلی گئی۔ اب تک ۴۵۰ سے زیادہ ڈرامے لکھ چکی ہوں۔

س: پہلا ڈرامہ کون سا لکھا اور ڈرامہ میں کن موضوعات پر لکھنا پسند کرتی ہیں؟

سیما غزل: میرا موضوع زیادہ تر معاشرتی رہا ہے۔ کبھی جہاں روایات، رشتوں کو جوڑتی ہیں اور خود ہی انہیں کسی بھی لمحے توڑ دیتی ہیں۔ کہیں ماں باپ سماج کے آگے مجبور ہو کر بیٹی کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ جہاں نہ اولاد کا حق ادا کیا جاتا ہے اور نہ اولاد اپنے فرائض نبھاتی ہے اور پھر چھوٹے چھوٹے گھروں میں جو بڑے بڑے طوفان اُٹھتے ہیں ان کی شدت سب تباہ کر دیتی ہے۔

بے حسی، خود غرضی اور نفسیاتی مسائل میں گھرا انسان نہ خود اچھی زندگی گزار پاتا ہے نہ کسی اور کو گزارنے دیتا ہے۔ یہ موضوعات ہوتے ہیں میرے۔ میں کچلے ہوئے انسانوں پر لکھتی ہوں جن کے چہروں پر مسکراہٹ تو ہوتی ہے مگر اندر کے طوفان کی شدت اسے ایک ایسی سمت لے جاتی ہے جہاں وہ دھرتی پر بوجھ بن جاتا ہے۔ میری تحریریں ان کے لیے آسرا ہوتی ہیں۔ میں ان سب کو آئینہ دکھاتی ہوں کہ وہ اپنی غلطیاں دیکھیں اور جان لیں کہ ان کا انجام کیا ہے یا وہ اپنی غلطیاں درست کر لیں اور چین کی زندگی گزاریں۔

میرا پہلا ڈراما سیریل "منزلیں" تھا۔ جسے شمیم برقی نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ وہ بہت زیادہ مقبول ہوا۔ اس کے بعد بہت زیادہ مقبول ہونے والے سیریلز یہ ہیں "مہندی، چاندنی راتیں، ہم سے جدا نہ ہونا، انا، کہاں تم کہاں ہم، اجازت، مورت وغیرہ ہیں اور پی ٹی وی پر ایک ڈرامہ چلا تھا "عورت کا گھر کون سا" جس پر مجھے نیشنل ایوارڈ ملا اور میں بہت خوش ہوئی۔ پی ٹی وی ہماری درس گاہ تھا اور ہے۔

س: ۲۰۰۰ء قبل کے پی ٹی وی ڈرامہ اور موجودہ ڈرامہ کو

آپ کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

سیما غزل: دیکھو ہر دور کا اپنا انداز، اپنا سچ اور اپنا جھوٹ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ زندگی ارتقا کرتی ہے۔ ایک جگہ تھمی نہیں رہتی۔ وقت گزرتا جاتا ہے۔ اس میں روایات سماجی، پیچیدگیاں اور معاشی بدحالی بھی سینیارٹی ڈال دیتی ہے اور انسان بھی تبدیل کے عمل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ اسی لیے پہلے جیسا نہیں رہتا۔ پرانے ڈرامے اُسی زمانے میں اچھے لگتے تھے اب اُٹھا کے دیکھیں سوائے چند گنے چنے ڈراموں کے علاوہ آپ کو اچھے نہیں لگیں گے۔ ایک عرصے کے بعد ہمارے ڈراموں کا بھی یہی حشر ہوگا اسی لیے ٹیکنالوجی اسی تیزی سے بدل رہی ہے اور آگے بڑھ رہی ہے۔ یقین کیجیے یہ ٹی وی چینل کے ڈرامے پیچھے رہ جائیں گے۔

س: کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ڈرامہ شاعری سے زیادہ موثر ذریعہ ہے؟

سیما غزل: شاعری سے ڈرامہ.....؟ نہیں شاعری بالکل الگ چیز ہے۔ میری شاعری میں پوری کی پوری میں خود ہوں کسی کو اچھی لگتی ہے یا نہیں مجھے پروا نہیں ہوتی۔ ڈرامہ الگ چیز ہے۔ ڈرامے میں ہمیں بہت سی چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ دیکھنے والوں کا سنسر کا اور معاشرتی اور سماجی رویے کا ہمیں موضوع ڈرامے کے لیے معاشرے سے اُٹھانا پڑتا ہے۔ شاعری ہماری ذاتی کیفیت ہے۔ ڈرامے اور شاعری میں بہت فرق ہے۔

س: ڈرامہ کا مستقبل کیا ہے؟

سیما غزل: ڈرامے کا مستقبل نہ بہت تاریک ہے نہ بہت روشن۔ دیکھیں دُنیا بدلتی جا رہی ہے اور بہت تیزی سے بدل رہی ہے۔ یہ بدلاؤ ڈرامے میں بھی آئے گا۔ پھر ہمارے معاشرے میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں رسم و روایات بدل رہی ہیں، آج جس طرح ہماری نوجوان نسل سوچتی ہے ہمیں انہیں ساتھ لے کر چلنا ہوگا ورنہ فاصلہ بڑھ جائے گا۔ آج ٹی وی کے ڈراموں سے زیادہ ویب سیریز مقبول ہو رہی ہیں۔ تھوڑے دنوں بعد آپ دیکھیں گی اور حیران رہ جائیں گی میڈیا بہت بدل جائے گا۔ ویسے ہماری دعا ہے کہ ڈراموں کا مستقبل روشن ہو کیونکہ اس فیلڈ سے بہت سے لوگوں کی روزی روٹی جڑی ہوئی ہے لیکن میں نئے آنے والے بچوں سے یہ کہوں گی کہ وہ پڑھیں دُنیا بھر کی چیزیں دیکھیں اور اندازہ لگائیں کہ کون سی تبدیلی آ رہی ہے۔ اسی تبدیلی کو مدنظر رکھیں تو لکھنے میں دشواری نہیں ہوگی۔ دوسری ایک گزارش کروں گی کہ خدا کے واسطے اُردو زبان کی شائستگی کا خیال رکھیں اور اس میں دوسری زبانوں کو ملا کر اردو کو کھچڑی نہ بنائیں۔

س: کس صنف میں لکھ کر ذہنی سکون ملتا ہے؟

سیما غزل: مجھے شاعری اور افسانہ لکھ کر سکون ملتا ہے۔ کبھی ایک نظم یا غزل پوری ہو جائے تو میں بہت خوش ہو جاتی ہوں۔ ڈرامہ لکھنا تو ہمارا پروفیشن ہے۔ میرے خیال سے کوئی ایسا موضع نہیں بچا جس پر میں نے نہ لکھا ہو یا مجھے کسی موضوع پر لکھنے کی حسرت ہو لیکن مجھ میں ایک کوالٹی ہے کہ میں ایک ڈرامے کو بھی کئی زاویوں سے لکھ سکتی ہوں۔ صرف نظریہ بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

س: آپ کی مکمل تصانیف اور اُن کا تعارف۔

سیما غزل: میں نے سات ناول لکھے ہیں جو نیٹ پر بھی موجود ہیں اور جو لوگ آج بھی پڑھتے ہیں مجھے ان کا فیڈ بیک ملتا ہے۔ وہ سات ناول یہ ہیں: (۱) کمند (۲) زرد پتوں کا بھنور (۳) اندھی رات کا بیٹا (۴) کال بیل (۵) چادر کے قیدی (۶) کوری آنکھیں (۷) آدھا وجود

س: کیا ہمارا ڈرامہ دوسرے ممالک کے ڈرامہ سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟

سیما غزل: میرا خیال ہے کہ ہاں..... ہمارا ڈرامہ دوسرے ممالک کے ڈراموں سے بہتر ہے۔ انڈیا کے ڈراموں سے تو بہت ہی بہتر ہے۔ وہ لوگ کیا لکھتے ہیں میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔ ان کے معاشرے میں تو بہت خطرناک موضوعات ہیں مگر پتہ نہیں کیوں وہ لوگ جو چیزیں دکھاتے ہیں سب مصنوعی لگتی ہیں۔

س: شاعری کو آپ کس مقام پر دیکھتی ہیں؟ کیا آج معیاری شاعری ہو رہی ہے؟

سیما غزل: شاعری بذاتِ خود ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے مگر فی زمانہ شاعری کے ساتھ بہت ظلم ہو رہا ہے جنہیں شاعری نہیں آتی وہ شاعری کے شوق میں مبتلا ہو کر یا تو اُلٹی سیدھی تک بندی کر کے خود کو شاعر یا شاعرہ سمجھنے لگتے ہیں یا پھر کسی سینئر شاعر کی معاشی کمزوری کا فائدہ اُٹھا کر ان سے لکھوا کر مشاعروں میں پڑھتے ہیں اور یقین کریں کہ ایک شعر سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اُن کا ذاتی ہے یا خریدا ہوا ہے۔ یہ صورت حال کم از کم کراچی میں بہت خراب البتہ پنجاب میں نئے بچے بڑی نئی بات کر رہے ہیں اور خوبصورتی سے کر رہے ہیں۔

س: آپ نے غیر ممالک کا سفر بھی کیا۔ ادبی سفر کہاں کہاں کا کیا؟

سیما غزل: جی بالکل کبھی کبھی ہو جاتی ہے شاعری۔ ہاں میں کئی ممالک میں مشاعروں میں بلائی گئی ہوں۔ قطر، بحرین، انگلینڈ اور امریکہ میں، میں نے کئی مشاعرے پڑھے ہیں۔

س: غیر ممالک میں اُردو ادب پر ہونے والے کام سے کیا آپ مطمئن ہیں؟

سیما غزل: جی باہر ان تمام ممالک میں جہاں میں گئی ہوں

اُردو سے بہت محبت کرنے والے موجود ہیں اور وہ سالانہ کئی کئی تقریبات اور ادبی نشست کرلاتے ہیں مجھے یہ دیکھ کر حیرانی بھی ہوتی ہے کہ اُن لوگوں نے اردو نہ بولنے والوں کو بھی شاعری کی طرف ملتفت کر دیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ آپ حیرانہوں گی کہ عرب اُردو شاعری کر رہے ہیں۔ فرانسیسی، مصری، ترکش، ازبکی، ایران اور انگریز اتنی اچھی شاعری کر رہے ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے۔ ان تمام ممالک میں اُردو سیمینارز ہوتے ہیں۔ عالمی مشاعرے ہوتے ہیں اور بڑے عمدہ ہوتے ہیں۔

س: کیا شاعری کی طرح ڈرامہ میں بھی گروہ بندیاں ہیں؟

سیما غزل: ہاں جناب۔ گروہ بندیاں ہیں اپنے اپنے گروپ بنا رکھے ہیں۔ ڈائریکٹر اپنے پسند کے آرٹسٹ کو ہی کاسٹ کرتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کردار کو سامنے رکھ کر کاسٹنگ کرتے ہیں۔ ان کے ڈرامے کامیاب ہو جاتے ہیں اور جہاں دوستیاں نبھائی جاتی ہیں وہاں.....

دیکھیں ادب میں گروہ بندیاں ادب کے ساتھ ظلم کرنے کے مترادف ہے اور میں نے کہا کہ کراچی میں ادبی صورت حال کافی نازک ہے۔ بہت کم ایسے مشاعرے دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں جن میں شرکت کا مزا آتا ہے۔ میرے خیال میں اگر لوگ بتشاعروں کو شاعر بنانے کی کوشش ترک کر دیں تو ہمارا ادب بچ سکتا ہے۔ ورنہ یہ سسک سسک کر دم توڑ دے گا۔

س: کیا آج کی شاعری کو ادب برائے ادب کہا جا سکتا ہے یا ادب برائے زندگی؟

سیما غزل: نہیں..... ادب برائے زندگی اب نہیں ہوتا۔ سوری میں بہت دکھی ہوں شاعری یا اُردو سیمینارز کا حشر دیکھ کر.....

اس میں یہ خیال نہیں رکھا جاتا کون کس مقام پر ہے۔ بلکہ دوستیاں زیادہ نبھائی جا رہی ہیں اور میں مطمئن نہیں ہوں کراچی میں ہونے والے بہت کم مشاعروں میں جاتی ہوں جہاں سن لیتی ہوں کہ کچھ بہت اچھے شاعر آ رہے ہیں اور سینئرز بھی۔

س: قدیم اور جدید شعرا میں کون کون پسند ہے؟

سیما غزل: مجید امجد کی نظمیں بہت پسند کرتی ہوں اور بار بار پڑھتی ہوں۔ اس کے علاوہ سلیم کوثر بہت اچھے شاعر ہیں اور ماشاء اللہ حیات ہیں۔ ویسے میر کو پسند کرتی ہوں اور پڑھا بھی کو ہے اور آج کے بچے بہت اچھا کہہ رہے ہیں۔ اُن میں بہت سے نام ہیں جنہیں سن اور پڑھ کر مجھے اچھا لگتا ہے۔

س: آپ کا پسندیدہ ڈرامہ کون سا ہے؟

سیما غزل: میرا پسندیدہ ڈرامہ مورت، اجازت اور آشتی ہے۔

س: اب تک کون کون سے ایوارڈ حاصل کیے؟

سیما غزل: میں نے ۱۳۱ ایوارڈ حاصل کیے ہیں جس میں نیشنل ایوارڈ بھی شامل ہے۔ چار لکس ایوارڈ اور "ہم" ایوارڈ ہیں اور بھی بہت سے ہیں۔

س: نئے لکھنے والوں کے لیے کوئی پیغام؟

سیما غزل: میرا نئے لکھنے والوں کے لیے یہی پیغام ہے کہ ڈرامے کو صرف پیسہ کمانے کا ذریعہ نہ سمجھیں بلکہ آپ پر بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ آپ کا لکھا ہوا اور بنا ہوا ڈرامہ دیکھنے والوں پر بہت تیزی سے اثر انداز ہوتا ہے۔ تو لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھا کریں کہ آپ کے قلم سے کوئی ایسی چیز نہ لکھی جائے جو معاشرے میں خرابی کا سبب بنے۔

گل فراز/ہڈالی

یہاں مصروف ہو کے بھی رہا بے کار اِتنا ہی
نہ کوئی عشق تھا ایسا، مگر میں خوار اتنا ہی
بچھڑنے پر ٹلا جب وہ سنی کوئی نہیں اس نے
کہ آخر سارے میں تھا میں بھی حصے دار اتنا ہی
بظاہر تو یہی لگتا ہے سب آسان ہی ہو گا
حقیقت میں مگر یہ کام ہے دشوار اتنا ہی
اب اُس نے کوئی لکھ کر تو نہیں دینی ہمیں یہ بات
کہ سب کے سامنے ہو سکتا ہے اقرار اتنا ہی
بہت واضح بتا دینے سے بنتی ہی نہیں وہ بات
ضروری ہے کسی بھی شعر میں اِظہار اتنا ہی
کوئی پلڑا تو بھاری ہونا ہے ہر ترازو کا
ابھی اقرار ہے اس کا یہاں انکار اتنا ہی
ضرورت سے زیادہ تو میں رکھتا ہی نہیں بالکل
مرا حصہ ہے پورا اور مجھے درکار اتنا ہی
اضافہ کرنا ہے مقدار میں آہستہ آہستہ
کہ ایسا کام ہو سکتا ہے پہلی بار اتنا ہی
بظاہر تو بہت سیدھا نظر آتا ہے گل، لیکن
ذرا سا کھول کر دیکھو، وہ ہے ہشیار اتنا ہی

.....

یہ دریا بھی ہو جائے گا پھر پار کسی دن
بس خود کو ذرا کرنا ہے تیار کسی دن
میں پاس اگر جاتا رہا اس کے لگاتار
اس کے لیے بن جائے گا دشوار کسی دن
حتمی تو جواب اس نے کبھی بھی نہیں دینا
انکار کسی دن ہے تو اقرار کسی دن
یوں روز ہی بس تھوڑا سا کرنے کی بجائے
کر دیتا ہوں اک دفعہ ہی بھرمار کسی دن
تارے تو نہیں توڑ کے لا سکتا فلک سے
لیکن تمھیں لے دوں گا نئی کار کسی دن
دلچسپی بہت پیدا ہوئی پہلے پہل، پھر
وہ مجھ سے اچانک ہوا بیزار کسی دن

نوید مرزا/لاہور

خوابوں میں نظر آتے ہیں جو خوب سے چہرے
تعبیر کے شیشے میں سجائے نہیں جاتے

لکھوں کیا موت کے تازہ خلاصے
زمیں پر رینگتے ہیں زندہ لاشے
قلم جب ہاتھ آئے گا ہمارے
لکھیں گے خود مُقدر کے نوشتے
بغاوت دیکھ کر اہلِ زمیں کی
برِ افلاک حیراں ہیں فرشتے
زمیں کی ظلمتوں کو ختم کر دو
فلک سے گرنے والے ہیں ستارے
تھکن سے چور ہو کر جس رُت میں
مسافر جنگلوں میں سو گئے تھے
ہر اک کی بات پر لبیک کہہ دو
عجب اس دورِ نو کے ہیں تقا[illegible]ے
اُجڑ جائے نہ میلہ [illegible]ندگی کا
بپا تک ہیں سا[illegible]ت کے تماشے
کوئی دشمن[illegible] ہوا ہے کیوں سکوں کا
فضا [illegible]یں چیختے ہیں کیوں دھماکے
جو پژمُردہ ہوئے باغِ امارت
غریبوں نے لہو سے اپنے سینچے
مجھے آتا ہے کانٹوں پر بھی چلنا
بکھیرو رہگذر میں اور کانٹے
کہیں جا کر ٹھہرنا ہی پڑے گا
کہاں تک جائیں گے ہم چلتے چلتے
نوید ایفا کا در ہے بند اب تک
لکھے ہیں بام پر وعدے ہی وعدے

مانا غمِ حالات چھپائے نہیں جاتے
کچھ درد ہیں ایسے جو بتائے نہیں جاتے

خوابوں میں نظر آتے ہیں جو خوب سے چہرے
تعبیر کے شیشے میں سجائے نہیں جاتے
یادوں کے نقوش آج بھی ہیں دل میں درخشاں
کچھ لوگ کسی طور بھلائے نہیں جاتے
کس طرح ترے نام کو ہونٹوں [illegible] پہ سجا لوں
افسانے محبت کے [illegible]ئے نہیں جاتے
سانسوں میں ابھی [illegible] ہے تری یاد کی خوشبو
لمحات [illegible]ت بھلائے نہیں جاتے
تنہا[illegible] کے جنگل میں بھٹکتا ہوں اکیلا
صدمات جدائی کے اُٹھائے نہیں جاتے
دیکھا تھا جنہیں جذبۂ وحشت کی نظر سے
وہ سرحدِ ادراک میں لائے نہیں جاتے
کیوں کر نہ مرے اشک ہوں پلکوں سے گریزاں
یہ گوہرِ کمیاب لٹائے نہیں جاتے
کیا منزلیں اوجھل ہیں نوید اب بھی نظر سے
کیوں پاؤں رو نو میں اُٹھائے نہیں جاتے

جذبوں کو خوش جمال نے خاموش کر دیا
یا وقت کے جلال نے خاموش کر دیا
جی تو یہ چاہتا تھا کہوں شہر بھر کا حال
لیکن ترے خیال نے خاموش کر دیا
وہ دے سکا نہ خونِ تمنّا کا کچھ جواب
اُس کو مرے سوال نے خاموش کر دیا
کیا کیا نہ اُس کی بزم میں کرتے بیان ہم
اک شخص کے جلال نے خاموش کر دیا
رُوداد لب پہ آئی جو پھولوں کے زخم کی
رنگینیوں کے جال نے خاموش کر دیا
لب پر تو آ گئی تھی حقیقت مگر نوید
فتنوں کے احتمال نے خاموش کر دیا

سادگی رُخ پر لیے پھرتے ہیں لوگ
دل میں اک محشر لیے پھرتے ہیں لوگ
کاٹتا ہے جو رگِ احساس کو
کیا وہی خنجر لیے پھرتے ہیں لوگ
ہر طرف خطرات کا عفریت ہے
سر ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں لوگ
آسماں کی سیر کرنے کے لیے
کس کے بال و پر لیے پھرتے ہیں لوگ
کیا زمیں اہلِ زمیں پر تنگ ہے؟
کیوں خلا میں گھر لیے پھرتے ہیں لوگ
سازشی بے ساکھیاں تھامے ہوئے
خُوبرو پیکر لیے پھرتے ہیں لوگ
اب دھماکوں کی صداؤں میں نوید
خوف کے پتھر لیے پھرتے ہیں لوگ

اک صدا کانوں میں اُتری جا رہی ہے
سانس کی زنجیر کھلتی جا رہی ہے
اشک پلکوں پر سلگتے جا رہے ہیں
آگ اندر سے پگھلتی جا رہی ہے
ساتھ چلنا تھا مگر میں تھک گیا ہوں
یہ سڑک لگتا ہے دوڑی جا رہی ہے
جس قدر میں تیز چلنا چاہتا ہوں
وقت کی رفتار بڑھتی جا رہی ہے
موت سے پہلے پہنچنا جا رہا ہوں
زندگی مجھ کو نگلتی جا رہی ہے

سلیم ساگر/لاہور

چلو مانا یہ میں ہوں آئنے میں
مگر یہ آئنہ حیران کیوں ہے

وقت کے ساتھ ہر شے تبدیل ہوتی ہے۔ لباس، طرزِ تعمیر، طرزِ تعلیم، اظہارِ خیال۔ اُردو شاعری نے شعرا کی آمد اور ان کی شرکت سے مختلف اور نئی نئی شکلیں بدلتی جا رہی ہے۔ سلیم سخن میں سلیم ساگر کی آمد جیسے شہر میں ایک نئے رنگ اور نئی دلکشی کا سبب بنتی ہے۔ سلیم ساگر کی کتاب ''آنکھ بھر عکس تمنا'' ایسے خوبصورت اشعار سے بھری پڑی ہے جو پڑھنے والے کے باطن میں ایک نیا طرزِ احساس روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔ شعروں کی وضاحت مشکل کام ہے۔ ان کا محسوس ہوتے جانا ہی اصل بات ہے۔ سلیم ساگر کے اشعار محسوس ہوتے ہیں۔ (منیر نیازی) 2004 میں شائع ہونے والے سلیم ساگر کے شعری مجموعے ''آنکھ بھر عکسِ تمنا'' سے منتخب غزلیں:

ترا اُترا ہوا چہرہ تو دیکھا
چلو ہم نے دیا بجھتا تو دیکھا
کہاں دیکھا تھا اس سے قبل کچھ بھی
تری آنکھوں میں جب دیکھا تو دیکھا
اُتر آیا تھا اک سیلاب مجھ میں
وہ دریا جب ذرا اُترا تو دیکھا
کئی مجھ میں مرے جیسے چھپے تھے
مرا آئینہ جب ٹوٹا تو دیکھا
خفا مت ہو مرے یوں دیکھنے پر
کہ میں کچھ دیکھ سکتا تھا تو دیکھا
اگر اب ٹوٹ بھی جائے تو کیا ہے
چلو ہم نے کوئی سپنا تو دیکھا
محبت موجزن تھی دل میں ساگر
یہ دریا موج میں آیا تو دیکھا

بھاگنے لگتا ہے آخر محفلوں سے آدمی
جانتا ہے دوستوں کو جیسے جیسے آدمی
تو دلِ حساس رکھتا ہے تو اتنا جان لے
دیر تک جیتے نہیں ہیں تیرے جیسے آدمی
تیرے اندر بس رہی ہے تیری ساری کائنات
تو اکیلا تو نہیں ہے، اے اکیلے آدمی
آنکھ بھر عکسِ تمنا، جسم بھر دشتِ جنوں
آئنے کے آئنے ہم، آدمی کے آدمی
عشق صاحب کھا گئے ہیں اچھے اچھوں کو جہاں
کیا کریں ایسے جہاں میں میرے جیسے آدمی
خواب بھی کیا دیکھنے ہیں ہم غریبوں نے اے دوست!
دولتِ تعبیر ہو تو خواب دیکھے آدمی
مسخ ہوتے جا رہے ہیں آئنوں پر آئنے
ختم ہوتے جا رہے ہیں کیسے کیسے آدمی
عشق ہے اک تجربہ جو یہ بتاتا ہے ہمیں
پاؤں پھیلاتا ہے کیوں چادر سے بڑھ کے آدمی
میں جو شہرِ فن سے گزرا، دیکھتا کیا ہوں سلیم
کیا بڑے فنکار تھے اور کتنے چھوٹے آدمی
آپ اپنے ساتھ لپٹے اور لپٹ کر سو گئے
اور کرتے بھی تو ساگر کیا اکیلے آدمی

دل نے صحرا میں بھی نہ وحشت کی
یہ نشانی ہے کس قیامت کی
اتنی آسانیاں نہ پیدا کر
دل کو عادت نہیں سہولت کی
اشک سہمے کھڑے تھے پلکوں پر
آخرکار اک نے ہمت کی
اول اول سبھی ہراساں تھے
آخرش میں نے پہلی ہجرت کی
میں بتاتا ہوں کیا پہاڑ ہے یہ
میں نے کاٹی ہے رات فرقت کی
تو مرے بازوؤں میں سمٹا تھا
آخری رات تھی محبت کی
آ گئے ہو تو بیٹھ جاؤ میاں
اب ضرورت نہیں اجازت کی
پھر مہکنے لگا بدن ساگر
پھر کلی کھل گئی ضرورت کی

کسی سلطنت کا تھا تاجور سو غلام کر دیا عشق نے
میں کہ خاص شخص تھا صاحبو! مجھے عام کر دیا عشق نے
مرے دشمنوں سے نہ ہو سکا وہ جو کام کر دیا عشق نے
غمِ ہجر سے مرا ربط تھا سو مدام کر دیا عشق نے
وہی ایک لمحہ آخریں، ترے وصل میں، مری بھول کا
وہی ایک عرصۂ عمر تھا جو تمام کر دیا عشق نے
اُسی ایک لمس کے کیف میں مری ساری عمر گزر گئی
وہ جو ایک بوسۂ اجنبیں مرے نام کر دیا عشق نے

ملو ایسے کہ پھر تعزیر بھی افلاک سے آئے
تمہاری خاک کی خوشبو ہماری خاک سے آئے
ملو ایسے کہ پیراہن میں سوئی سلوٹیں جاگیں
ملو ایسے کہ ملنے کی سند پوشاک سے آئے
ملو ایسے کہ ڈھل جائیں اکائی میں بدن اپنے
مرا آنسو تمہارے دیدۂ نمناک سے آئے
مرا معیارِ غم کیا ہے کہ ساگر رنج کی لذت
جگر کے زخم سے پہنچے نہ دل کے چاک سے آئے

مختصر ادبی خبریں

✧ ناز بٹ کا پہلا شعری مجموعہ ''وارفتگی'' چھپ گیا۔ جس کی تقریب رونمائی لاہور رائٹرز کلب کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔

✧ معروف شاعر، کالمسٹ اور ٹی پروڈیوسر شاہد چوہدری انتقال فرما گئے۔

✧ عالمی ادب اکادمی کے زیر اہتمام آرٹ کونسل راولپنڈی میں شہدائے APS مشاعرہ منعقد ہوا۔

✧ ملتان لٹریری کلب اور اکادمی ادبیات ملتان کے اشتراک سے عباس تابش کے ساتھ ایک شام اور محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔

✧ ایوان اقوال میں جشن اقبال کی سہ روزہ تقریبات منائی گئیں۔

✧ ۱۰ دسمبر کو بزمِ نگارِ ادب پاکستان کے زیر اہتمام آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی میں مشاعرہ منعقد ہوا جن میں نامور شعرا نے شرکت کی۔

✧ کالم نگار اسحاق جیلانی کے والد خالق حقیقی سے جا ملے۔

✧ کل پاکستان محفل مشاعرہ ٹیاری صوبہ سندھ ادبی تنظیم کاز اور عالمی ادبی اکادمی کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ جس میں تمام زبانوں سے تعلق رکھنے والے شعرا نے شرکت کی۔

✧ کاروانِ ادب کی ماہانہ شعری نشست انعقاد پذیر ہوئی۔ جس میں صدارت کے فرائض شہزاد نیر اور مہمان خصوصی ارشد شاہین تھے۔

✧ گزشتہ دنوں میں معروف شاعر نصیر احمد ناصر کی صاحبزادی کی شادی کی تقریب نہایت دھوم دھام سے منعقد ہوئی۔

✧ اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام ''اہل قلم سے ملیے'' کی ۳۵ ویں تقریب میں معروف شاعر اور محقق جمیل یوسف کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔

✧ زاویہ کے زیر اہتمام بزمِ یارانِ سخن ہیوسٹن (امریکہ) باسط جلیلی کے اعزاز میں یادگار محفل شعر ادارہ فروغِ قومی زبان میں منعقد ہوئی۔ صدارت جلیل عالی اور مہمان خصوصی میں افتخار عارف اور سیّد نصرت زیدی تھے۔

✧ معروف ادیب اور ڈرامہ نگار پروین عاطف انتقال فرما گئیں۔

✧ ۲ دسمبر بزمِ تقدیس ادب پاکستان کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ بیادِ سہیل غازی پوری مرحوم منعقد ہوا۔ صدارت جاذب قریشی، مہمانِ خصوصی ساجد رضوی اور مہمانِ اعزاز ظہور الاسلام جاوید کی تھی۔

✧ نثار ناسک صاحب ان دنوں کافی علیل ہیں۔ انہوں نے مشہور نغمہ دل دل پاکستان جان جان پاکستان لکھا۔

✧ صابر ناز کی کتاب کی تقریب پذیرائی منعقد ہوئی۔ کتابوں کا نام ''تانا پگ دا'' ہے۔

✧ معروف سینئر فنکار اور کامیڈین مرزا شاہی انتقال فرما گئے۔

✧ معروف شاعرہ رشیدہ جہاں ان دنوں سخت علیل ہیں۔

✧ ادارہ اردو کے زیر اہتمام ڈاکٹر وزیر آغا یادگاری خطبہ کے سلسلے میں پہلا خطبہ خواجہ محمد زکریا نے دیا۔

✧ حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کا ہفتہ وار اجلاس ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی صدارت میں ہوا۔

✧ پاکستان کرسچین رائٹرز گلڈ لاہور نے کرسمس مشاعرہ منعقد کروایا۔ صدارت پروفیسر وکٹوریا پیٹرک کی تھی جبکہ مہمانِ خصوصی آسناتھ کنول تھیں۔

✧ گزشتہ دنوں معروف شاعر سلیم فوز کے چھوٹے بھائی انتقال فرما گئے۔

✧ مجلس فروغِ اردو ادب دوحہ قطر کے زیر اہتمام ۵۲ ویں عالمی فروغِ اردو ادب ایوارڈ کی تقریب منعقد ہوئی۔ جبکہ ۲۴ ویں سالانہ عالمی مشاعرہ بیادِ مشتاق احمد یوسفی کی تقریب بھی رونما ہوئی۔

✧ معروف شاعر عارف فرہاد کے بڑے بھائی انتقال فرما گئے۔

✧ دوسرا سالانہ مشاعرہ بیادِ منیر نیازی مجلس مباحث جامعہ لاہور کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ صدارت حمیدہ شاہین جبکہ مہمانِ خصوصی فیصل ہاشمی تھے۔

✧ بیلی ادبی و ثقافتی تنظیم ڈنمارک کے زیر اہتمام ایک بہت عمدہ نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا۔

✦ معروف شاعر حق سرشار کے بھانجے مرزا ساجد بیگ انتقال کر گئے۔

✦ وزیر اعلیٰ پنجاب کے کالم نگار چوہدری اکرم نے سینئر قلم کاروں سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کا اہتمام قلم دوست نے کیا۔

✦ بزمِ چغتائی کے زیر اہتمام نعتیہ مشاعرہ انعقاد پذیر ہوا۔ صدارت عباس مرزا نے کی۔

✦ حلقہ ارباب ذوق کے زیر اہتمام ڈاکٹر خورشید رضوی کی صدارت میں نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا۔

✦ خوبصورت ناول ''جلتا مسافر'' اور ''دستک نہ دو'' کی خالق الطاف فاطمہ اب ہم میں نہیں رہیں۔

✦ میو گارڈن کلب میں ڈاکٹر سعید نقوی کے اعزاز میں ایک شام رکھی گئی جس میں امجد اسلام امجد، عباس تابش، شکیل جاذب، رخشندہ نوید، سلمیٰ اعوان، نیلم احمد بشیر اور حمیدہ شاہین نے خصوصی شرکت کی۔

✦ اردو زبان و ادب کا روشن ستارہ ڈاکٹر عطش درانی بھی انتقال فرما گئے۔

✦ فن لورز قطر کے زیر اہتمام گزشتہ دنوں شاعرات مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔

✦ معروف رائٹر الطاف فاطمہ بھی ہم میں نہیں رہیں۔

✦ محمد رفیع کی طرز کے امین معروف گلوکار محمد عزیز بھی انتقال کر گئے۔

✦ ادبی تنظیم تمثیل کے زیر اہتمام معروف شاعر دلاور علی آذر کے ساتھ ایک شام رکھی گئی۔ صدارت ندیم بھابھہ نہ کی۔

✦ گزشتہ دنوں کراچی آرٹس کونسل میں یادگار گیارہویں عالمی اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔

✦ معروف شاعر اعتبار ساجد کے بڑے بھائی انتقال فرما گئے۔

✦ معروف کالم نگار اور شاعر اجمل نیازی کی والدہ انتقال فرما گئیں۔

✦ معروف شاعر صفدر سلیم سیال جھنگ میں انتقال فرما گئے۔

✦ توانا لہجے کے معروف شاعر عبدالقادر تاباں کے ساتھ ایک شام کا اہتمام ادبی تنظیم نئے اُفق ٹیکسلا واہ کینٹ نے کیا۔

✦ ادبی تنظیم قرطاس اور پلاک کے زیر اہتمام ایک شاندار محفل مشاعرہ ہوئی۔ صدارت خالد شریف نے کی۔

✦ امجد اسلام امجد کے فکر و فن پر مشہور محقق اور نقاد سیّد تقی عابدی کی تازہ ترین تصنیف ''امجد فہمی'' کی تقریب پذیرائی پلاک میں منعقد ہوئی۔ صدارت خورشید رضوی کی تھی۔

✦ پاکستان فیڈرل یونین آف کالمسٹ کے زیر اہتمام چھٹی سالانہ ورکشاپ اسلام آباد ہوٹل میں معروف مصنف و دانشور پروفیسر فتح محمد ملک منعقد ہوئی۔

✦ ممتاز دانشور اور کالم نگار منشا قاضی روڈ حادثے میں شدید زخمی ہو گئے۔

✦ معروف شاعر خالد شریف کے بہنوئی انتقال فرما گئے۔

✦ اٹک کے بزرگ شاعر ملک عبداللہ راہی انتقال فرما گئے۔

✦ انٹرنیشنل اکیڈمی آف لیٹرز نے معروف شاعر و ڈرامہ نگار سرمد صہبائی اور ممتاز شاعرہ نسیم سید کے ساتھ Meet the Writer پروگرام کا اہتمام کیا۔

✦ بزم اہل سخن فرانس کے زیر اہتمام یادگار محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔

✦ معروف شاعر ناصر علی سیّد کے پوتے کا انتقال ہو گیا۔

✦ حرف اکادمی کے زیر اہتمام ساحر لدھیانوی کی یاد میں مذاکرے کا اہتمام ہوا۔ صدارت روش ندیم کی تھی جبکہ مہمان خصوصی اعتبار ساجد تھے۔

✦ مشہور فکشن نگار قاضی عبدالستار دہلی میں انتقال فرما گئے۔

✦ منظوم لائل پور کے زیر اہتمام محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ صدارت ناصر مجید نے کی۔

✦ پاکستان ادب ورثہ کے زیر اہتمام شاکر شجاع آبادی کے اعزاز میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔

✦ معروف بزرگ پنجابی کے شاعر بابا بالم گجراتی رُخصت ہو گئے۔

✦ معروف شاعرہ فہمیدہ ریاض انتقال کر گئیں۔

✦ معروف ادیب ابصار عبدالعلی دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔

✦ معروف شاعر حماد نیازی کے والد گرامی انتقال کر گئے۔

نامہ ہائے احباب

پیارے حسن عباسی!

السلام علیکم۔ نومبر کا شمارہ جنت نگاہ ہوا۔ ٹائٹل اسی طرح ہے جیسے ہونا چاہیے۔ تحریریں بھی پسند آئیں۔ آج بارہ ربیع الاول ہے۔ عید میلاد النبی، ارژنگ کی عقیدت نگاری اثر رکھنے والی ہے۔ پچھلے شمارے میں آپ نے میری حمد کتاب ''اکتفا'' سے لے کر شائع کی تھی۔ چلو اسی طرح آپ نے ''اکتفا'' کی خبر تو لی۔ آپ پائے کے شاعر ہیں۔ آپ کی شاعری کے ہر طرف ڈنکے بج رہے ہیں۔ خدا آپ کو اور توفیق دے۔ محل نظر نہ ہو تو کہوں حمد کی امیجری میں عاجزی کا عنصر ہوتا ہے۔ شوخی نہیں ہوتی۔ عاجز بندہ اللہ تعالیٰ سے شوخی کرے بھی کیا۔ ''نخرہ'' ایک لڑکی اچھی لگتی ہے وغیرہ۔

باری تعالیٰ سے مخاطب ہونے دامے پیرائے نہیں۔ اُمید ہے آپ اس حقیر پر تقصیر کی رائے پر برا نہ مانیں گے۔ یہ ''حمدیہ'' سائل ظفر اقبال نے جدت کے بہانے سے رواج دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر حمد کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ میرے خط شاید آپ تک نہیں پہنچتے ''جواب آیا'' مولوی مدن والی بات نہیں۔

آصف ثاقب، بوئی ہزارہ

برادرِ محترم جناب حسن عباسی صاحب!

سلامِ نیاز۔ ماہنامہ ''ارژنگ'' باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ اکتوبر کا شمارہ حسب روایت خوبصورت تحریروں کا مرقع ہے۔ صفحہ اول پر طلوعِ شمس کا منظر نہایت پرکشش ہے۔ ناز بٹ صاحبہ کے انٹرویو سے لے کر محترمہ لبنیٰ صفدر کی گفتگو تک ہر تحریر دامن دل کو کھینچتی ہے۔ افسانے ہوں یا نظم و غزل آپ کے حُسن انتخاب کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سعدیہ سیٹھی کی غزل خصوصیت کے ساتھ پسند آئی۔ حمد و نعت سے روح کو غذا ملتی ہے۔ بیرونِ ملک آپ کی مشاعروں میں شرکت اور یادگار تصویروں نے گھر بیٹھے مجھے کینیڈا کی سیر کا مزہ دیا۔ لاہور جاتا ہوں تو اکثر دوستوں سے ملاقات نہیں ہو پاتی۔ لاہور میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا کارِ داد ہے۔ کسی دن یہ کشٹ کھینچنا ہی پڑے گا۔ کالج کے زمانے کی ایک نظم نظر ثانی کے بعد ''ارژنگ'' میں اشاعت کے لیے ارسال کر رہا ہوں عامر بن علی صاحب کی خدمت میں آداب۔

خیر اندیش

مظفر حسن منصور، خوشاب

خدا کرے آپ مع اہل و عیال خوش و خرم اور خیریت سے ہوں۔ (آمین)

''ارژنگ'' باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ آپ کی محبتوں اور نوازشوں کا بہت بہت شکریہ۔ ایک غزل برائے ''ارژنگ'' ارسالِ خدمت ہے۔

سیّد نصرت صدیقی

فیصل آباد

محترم برادرم حسن عباسی صاحب! السلام علیکم

اُمید ہے علم و ادب کی آبیاری میں مصروف بہ عمل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

محترم! آپ کی بزم میں میرا یہ پہلا مراسلہ ہے۔ ''ارژنگ'' اردو ادب میں بہت خوب صورت شاہکار ہے۔ معیاری کتابت، صاف ستھرا کاغذ، بہترین سرورق، الغرض بے شمار خوبیاں ہیں جو اس کی پسندیدگی کا باعث ہیں۔ آج کے اس مادی دور میں قومی زبان اُردو کی اس طرح سے بے لوث خدمت یقیناً عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔

''ارژنگ'' کے صفحات کے لیے اپنی کچھ غزلیں بھیج رہا ہوں۔ اس اُمید کے ساتھ کہ آپ مجھ بے ادب کی حوصلہ افزائی کا باعث بنیں گے۔

راجا غلام اصغر طاہر

محترم جناب حسن عباسی صاحب! آداب

اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ''ارژنگ'' موصول ہوا۔ بے حد شکریہ!! مجھے یاد ہے کہ میں خط لکھتی رہتی ہوں۔ مگر کافی عرصے سے میری کسی بھی تحریر کو پذیرائی نہیں ملی۔ خیر یہ سراسر آپ کا استحقاق ہے۔ اس کے باوجود میں نے بس ذرا محسوس کیا اور کہہ دیا۔ آپ کے عالمی دوروں کا بیان اور جھلک تو فیس بک پر نظر آ جاتی ہے۔ اللہ آپ کو اور ترقی دے۔ رسالہ ہمیشہ کی طرح شاندار ہے اور سبھی تحریریں اور انٹرویوز بردست۔ ناز بٹ صاحبہ کا انٹرویو اچھا لگا۔ سلامت رہیں!!

آسناتھ کنول

لاہور

ادب میں گروہ بندیاں
ادب کے ساتھ ظلم کرنے کے مترادف ہے

ڈرامے کو صرف پیسے کمانے کا ذریعہ نہ سمجھیں

نامور ڈرامہ نویس اور شاعرہ

سیما غزل

سے معروف شاعرہ اور کالم نویس

لبنیٰ صفدر کی گفتگو

ارژنگ: اپنا نام اور خاندانی پس منظر بتایئے۔

سیما غزل: مجھے سیما غزل کہتے ہیں۔ خاندان ادبی تھا اس لیے وہ رنگ مجھ میں بھی موجود تھا۔ والد ریڈیو پاکستان میں اسکرپٹ رائٹر تھے۔ شاعر تھے اور جگر مرادآبادی کے ہم عصر اور دوست تھے۔ یہ بدقسمتی ہے ہماری کہ ان کا مجموعہ نہیں چھاپ سکے اور ان کی کتابیں، اسکرپٹ اور غزلیں جو بڑی احتیاط سے رکھوائی تھیں بارش میں ضائع ہوگئیں۔ ایک ڈائری چھوٹا بھائی لے گیا اور پھر جانے اس نے کہاں کی۔ بڑی بہن حجاب عباسی معروف شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں۔ بڑے بھائی بھی ٹی وی پلے رائٹر تھے۔ امی شاعرانہ ذوق رکھتی تھیں اور تھوڑی بہت شاعری کر بھی لیتی تھیں۔

یہ سارا ماحول ایسا تھا کہ ہم چاہتے بھی تو اس ماحول سے نکل نہ سکے۔ کیونکہ مشاعروں میں پاپا کے ساتھ جاتے جو نشستیں گھر پر ہوتیں وہ سنتے، بڑے بڑے لوگوں کو پاپا کے پاس آتے دیکھتے۔ ان کی باتیں سنتے۔ شاید اسی وجہ سے میرے

بیٹا۔ سید علی رضا (اسامہ)

خاندان میں جتنے لوگ بھی ہیں وہ کریٹو تھے۔ میرا بیٹا سیّد علی رضا (اسامہ) ڈائریکٹر رہا ہے جیو کا۔ جہاں اس نے بڑی بڑی سیریلز بنائی ہیں۔ ''کاش میں تیری بیٹی نہ ہوتی'' یہ پلے بہت اچھا تھا۔ لوگوں نے اسے بہت پسند کیا تھا۔

میرے لکھنے کی شروعات تو شاید 14 یا 15 سال کی عمر میں ہوئی مگر شاعری بہت پہلے شروع کر دی۔

مجھے جو اپنا پہلا شعر یاد آ رہا ہے وہ 14 برس کی عمر میں کچھ اس طرح ہوگا۔ میرا پہلا شعر حاضر ہے۔

قبل آغاز کے انجام کا ڈر ہوتا ہے
دور اندیش بڑا تنگ نظر ہوتا ہے

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

ماہنامہ ارژنگ کے مدیران کے عہدِ حاضر
کے نامور دانشوروں سے تاریخی انٹرویوز کا مجموعہ

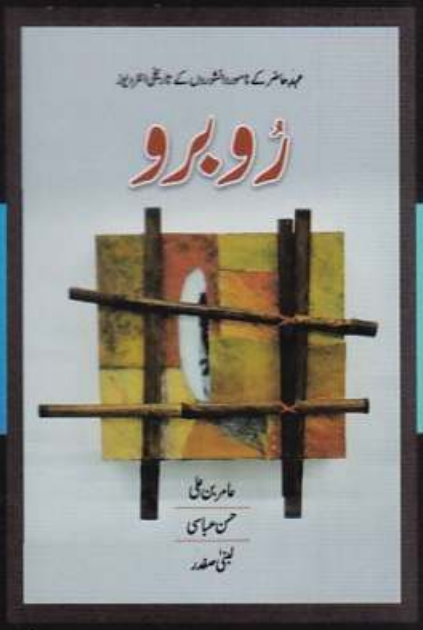

رُوبرو

اشاعت کے آخری مراحل میں

عامر بن علی | حسن عباسی | لبنیٰ صفدر

عامر بن علی کی دیگر کُتب

- محبت چھو گئی دل کو (شعری مجموعہ)
- چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
- سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
- یاد نہ آئے کوئی (شعری مجموعہ)
- محبت کے دو رنگ- گبریلا مسترال اور پابلو نرودا (ہسپانوی زبان سے براہِ راست اُردو میں کیے گئے تراجم)
- گفتگو (انٹرویوز)
- مکتوب جاپان (کالمز)
- آج کا جاپان (سفرنامہ)
- جہاں گردی (سفرنامہ)
- محبت کے موسم (زیرِ طبع)
- گردِ سفر (زیرِ طبع)
- مدیر اعلیٰ: ماہنامہ ارژنگ لاہور

حسن عباسی کی دیگر کُتب

- جگنو میری سوچوں کے (شاعری)
- ہم نے بھی محبت کی ہے (شاعری)
- ایک محبت کافی ہے (شاعری)
- اک شام تمھارے جیسی ہو (شاعری)
- سائیں (حمدیہ مجموعہ)
- صاحب (حمدیہ مجموعہ)
- محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو (سفرنامہ)
- ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا (سفرنامہ)

لبنیٰ صفدر کی دیگر کُتب

- تمھیں تو میرا ہونا تھا (شاعری)
- محبت آئینہ کر لو (شاعری)
- یہ ہجر ہے یا وصال ہے (شاعری)
- بارشوں کے موسم میں (شاعری)
- خوشبو ہے وہ صندل کی (شاعری)
- تم محبت کا استعارہ ہو (شاعری)

Design By: 0300-4529821
MUHAMMAD AHSUN Gull

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com